ڈاکٹر ناصر عباس نیر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ء اردو
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ، ہائیڈل برگ یونیورسٹی، جرمنی میں موجود نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات
(توضیحی فہرست مع منتخب نصابی کتب کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں توضیحی مطالعہ)
(حصہ دوم)

This article is the 2nd part of the author's postdoctoral research (first one appeared in the 8th issue of Meyar, July- Dec, 2012) he conducted at Heidelberg University Germany in 2011. The article consists mainly of descriptive bibliography of Urdu Courses, available at South Asia Institute, Heidelberg University, Germany which were mostly prepared by natives, but under strict restrictions of colonial administrators of British India for vernacular schools. Furthermore, main contents of the selected course books have been analysed and interpreted in postcolonial perspective.

Postcolonialism, as theorized by Said, Bhabha and others, seeks to underpin the multilayered ideological constructions of texts produced under cultural influences of colonial power structures. The author of the article is of the view that the process of production and selection of the contents of course books got heavily influenced by the hegemonic cultural strategy of colonial rulers which can be brought to light by deconstructive and symptomatic modes of reading the texts.

نوٹ: زیرِ نظر صفحات راقم کی پوسٹ ڈاکٹرل تحقیق پر مشتمل ہیں، جس کا پہلا حصہ معیار کے گزشتہ شمارے (نمبر ۸، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء) میں شایع ہوا تھا۔ پہلے حصے میں نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات کے تجزیے سے قبل ابتدائیہ درج کیا گیا تھا جس میں نو آبادیاتی دور کے نظامِ تعلیم، کلاسیکی اور ورنیکلر زبانوں کی تعلیم، اردو نصابات کی تیاری کے عمومی مقاصد اور مابعد نو آبادیاتی مطالعے کی نہج پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ چوں کہ یہ دوسرا حصہ، پہلے حصے ہی کا تسلسل ہے، اس لیے ابتدائیہ دوبارہ درج کرنا غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔

گلبنِ نثر، سید ہادی علی، تعداد صفحات: ۲۳۲، نیشنل پریس، بار سوم، ۱۹۴۰ء، الہٰ آباد

یہ کتاب ہائی سکول اردو کورس کے طور پر مرتب کی گئی تھی۔ اس میں بارہ منتخب نثر پارے شامل کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔	خطوط	سر سید احمد خاں	۲۔ گزرا ہوا زمانہ	سر سید احمد خاں
۲۔	تعلیم و تربیت	سر سید احمد خاں	۴۔ دلی کے مسلمانوں کی سوسائٹی	ڈاکٹر نذیر احمد
۵۔	عبدالرحیم خان	مولانا محمد حسین آزاد	۶۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	مولانا محمد حسین آزاد

۷۔ سیر زندگی	مولانا محمد حسین آزاد	۸۔ایک چھوٹے ذرے کی سرگزشت	مولانا عبدالحلیم شرر
۹۔ منازلِ حیات	راشد الخیری	۱۰۔زود پشیماں	مولانا عبدالماجد بی اے
۱۱۔ بغداد کا سفر	سید سجاد حیدر	۱۲۔کار طفلاں تمام خواہد شد	رشید احمد صدیقی

فہرست میں درج نہیں،تاہم کتاب کے آخر میں ان بارہ نثر پاروں کے آٹھوں مصنفین کی مختصر'سوانح عمریاں' بھی دی گئی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مرتب کی طرف سے مختصر دیباچہ ہے۔اس میں کتاب کے مندرجات کے انتخاب کی وجہ جواز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مرتب کے مطابق'' اس کی تیاری میں ان ہدایات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو محکمہ تعلیم کی طرف سے جاری ہوئی تھیں۔''ہر چندان ہدایات کی وضاحت نہیں کی گئی،تاہم مندرجات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہدایات کیا ہوں گی۔ان نثر پاروں ہی کو شامل کیا گیا ہے جو براہ راست یا بالواسطہ نو آبادیاتی آئیڈیالوجی کی ترجمانی کرتے ہیں۔بس ایک نثر پارہ (زود پشیماں استثنیٰ کی حیثیت رکھتا ہے)۔مئولف نے اس انتخاب کے مشمولات کے بارے میں یہ کہنا ضروری خیال کیا ہے کہ'' اس انتخاب میں قدیم و جدید ہر دور کے مصنفین کی انشا پردزی کے بہترین نمونے موجود ہیں جس سے طالب علم اردو نثر نگاری کی قدیم اور جدید دونوں روشوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے اور یہ بھی اندازہ ہو سکے کہ زبان اردو نے اپنے مدارجِ ترقی کو کیوں کر طے کیا ہے۔''مئولف کے قدیم و جدید کے تصور میں شاید انیسویں صدی کے مصنفین (سرسید، نذیر احمد، آزاد،شرر) قدیم اور بیسویں صدی کے لکھنے والے (راشد الخیری،عبدالماجد،سجا د حیدر اور رشید احمد صدیقی) جدید ہیں۔حالاں کہ یہ کتاب بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مرتب کی گئی۔کیا اردو نثر کی قدیم و جدید روشوں اوراردو کے مدارجِ ترقی کا اندازہ مئولف کے قدیم و جدید کے اس تصور سے لگایا جا سکتا ہے جو پون صدی سے بھی کم عرصے پر محیط ہے ؟اس تصور میں ملا وجہی ، میر امن ، رجب علی بیگ سرور اور غالب نہیں آتے۔ یہ درست ہے کہ ہائی سکول کے طالب علموں کو اردو نثر کی پوری تاریخ نہیں پڑھائی جاسکتی ،مگراصل سوال یہ دعویٰ ہے کہ کتاب میں شامل آٹھ مصنفین اردو نثر کی پوری تاریخ کے نمایندہ ہیں۔ اسے لاعلمی کا شاخسانہ کہنے کے بجائے اردو نثر کی تاریخ کا '' ایک نیا علم'' کہیں گے،جس کی ترویج مطلوب تھی۔اس علم کے مطابق اردو نثر شروع ہی علی گڑھ تحریک سے ہوتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اس کتاب میں شامل تمام نثر پارے کسی نہ کسی شکل میں علی گڑھ اور سرسید کے مکتبہء فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔غور کریں تو یہاں ''شامل'' اور ''خارج'' کرنے کا وہی منہاج نظر آتا ہے جسے نو آبادیاتی فکر میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اس سب کوایک نیا زمرہ بنا کر ''شامل'' کرنا جو مذکورہ فکر سے ہم آہنگ ہے اور اس سب کو'' خارج'' رکھنا جو اس فکر کے لیے قابل قبول نہیں یا اسے فروغ دینے میں نا کام ہے۔علی گڑھ تحریک سے اردو نثر کی تاریخ شروع کرنے کی وجہ اس تحریک کا نقطہء نظر ہے۔اور یہی نقطہء نظر کتاب کے مندرجات میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ مئولف نے کس معیار کے تحت ''انشاپردازی کے قدیم وجدید نمونوں'' کو بہترین قرار دیا ہے۔بہترین کا تصور ادبی نہیں۔ان کی ادبیت فقط اس حد تک ہے کہ انھیں نام ور ادیبوں نے لکھا ہے۔ تعلیمی نصابات میں کسی تحریر کے'' بہترین'' ہونے کا معیار،تعلیمی ہدایات سے بہتر سے بہتر انداز میں ہم آہنگ ہونے میں مضمر ہے۔ گویا'' بہترین'' کا تصور''باہر'' سے ہے،ادب کے''اندر'' سے نہیں۔

مئولف کے ذہن میں اردو نثر کی اصناف کا واضح تصور بھی نہیں۔سب نثر پاروں کو مضامین کہا گیا ہے۔مئولف کی نظر میں خطوط، ناول، افسانہ، ڈراما، سفرنامہ سب مضامین ہیں۔لگتا ہے ساری اہمیت خیال یا آئیڈیالوجی کو دی گئی ہے، خواہ وہ کسی پیرائے میں ظاہر ہوئی ہو۔

کتاب کے مندرجات کے انتخاب میں دو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں: طلبا کے اخلاق سنوارنا اور اخلاق سنوارنے کے لیے یورپ کو بطور مثالی نمونہ پیش نظر رکھنا۔طلبا کے اخلاق سنوارنا ایک بے حد پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس آدمی یا گروہ کے اخلاق سنوارنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں۔کیا سکول کے بچے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں؟ نو آبادیاتی سیاق میں یہ سوال، تعلیمی نفسیات کا ایک عام مسئلہ ہونے کے بجائے، ایک 'قومی' مسئلہ ہوتا ہے۔نو آبادیاتی ممالک میں سکول کا بچہ اپنی قومی شناخت کی دہیز پر چھائیوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔اردو مسلمانوں کی قومی زبان قرار دی گئی، لہٰذا اردو نصاب پڑھنے والے طالب علم نو آبادیاتی ہندوستان میں مسلمانوں کی اس شناخت اور حیثیت سے آزاد نہیں تھے، جو انگریز سرکار نے ان پر مسلط کی تھی۔اس کتاب کے مندرجات کا ایک اہم مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سکول کے طالب علموں کو شدت سے باور کرایا جائے کہ وہ جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں وہ طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہے۔انھیں ایک ایسے احساسِ جرم میں مبتلا کرنے کی کوشش ملتی ہے، جو خود انھوں نے نہیں کیا، ان کے باپ دادا سے منسوب کیا گیا ہے۔چند مثالیں دیکھیے:

> مسلمانوں پر نہایت بد اقبالی اور ادبار چھایا ہوا ہے۔وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں اور وہ مطلق اپنے نقصان کو نہیں سمجھتے۔اس پر حسد اور کینہ ان میں بارہا بہ نسبت ہندوؤں کے اور جھوٹی دشمنی زیادہ ہے اور کسی قدر مفلس بھی ہیں۔ان وجوہات سے وہ ہرگز اس قابل نہیں ہوتے جو اپنی بھلائی کے لیے کچھ کر سکیں۔
>
> (سرسید: خط بنام محسن الملک)
>
> یہی ٹھیک ٹھیک حال ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ظاہر میں طمطراق بہت کچھ، مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار، جبہ و کرتہ سے بہت کچھ، مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہی۔۔۔ہم اپنے یہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔
>
> (سرسید: تعلیم و تربیت)
>
> مگر وہ (سید صادق) اتنا ہی جانتے تھے کہ مذہبی تعصب مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کا مانع ہے۔۔۔مسلمانوں کی کچھ ایسی مت ماری پڑی کہ یہ لگے انگریزوں سے بدگمانی رکھنے۔نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا ہونا بھی کیا تھا کہ دوسرے لوگ بازی لے گئے اور یہ منہ دیکھتے کے دیکھتے رہے۔بھلا کہیں خدا سے بندے کی ضد چلتی سنی ہے۔مٹ گئے۔تب کچھ چیتے۔پھر بھی سب نہیں، ہزاروں میں ایک آدھ بھی دلی میں نہیں کہ اپنی پرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر خدا کا خاص غصہ ہے، نعوذ باللہ من غضب اللہ اور وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔
>
> (نذیر احمد: دلی کے مسلمانوں کی سوسائٹی)

سرسید اور نذیر احمد جن مسلمانوں کی ''حالتِ زار'' کا نقشہ کھینچ رہے ہیں، وہ علما اور اشراف ہیں۔ یہاں ''مجازِ مرسل'' سے کام لیتے ہوئے جزو سے کل مراد لیا گیا ہے۔ اس جزو کے بھی ایک طبقے نے جدید تعلیم اور اس کے علمبرداروں کی مخالفت کی اور بالعموم مذہبی بنیادوں پر کی۔ ان کے مخالفانہ نقطۂ نظر کو تمام مسلمانوں کے ''ادبار، بد حالی، تعصب، حسد، کینہ'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان سب برائیوں کو خدا کے غضب سے منسوب کیا گیا ہے۔ گویہ انھی لوگوں نے کیا ہے جو ہر شے کا عقلی جواز تلاش کر رہے تھے، مگر مسلمانوں کی حالت کو خدا کے غضب سے منسوب کرنے میں بھی ایک 'حکمت' ہے۔ تاریخ کو ایک انسانی عمل سمجھنے اور ایک خاص تاریخی حالت کے ذمے دار انسانی عناصر اور انسانی مفادات سے یہ حکمت توجہ ہٹاتی ہے۔

مسلمانوں کے ادبار کی حقیقت باور کرانے کے بعد، یہ فطری، منطقی اور ضروری لگتا ہے کہ اس کا 'حل' بھی بتایا جائے۔ بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کے بیان کے بعد، اسے سنوارنے کا لائحۂ عمل پیش کرنے میں بھلا کیا قباحت ہوسکتی ہے؟ یورپ اور یورپ کی طرز کے اداروں اور نظریات کو بہ طور 'حل' پیش کیا گیا ہے۔

> انھوں نے دیکھا کہ اس بدنصیب شہر (دہلی) کے بدنصیب مسلمانوں کو محاربات سلطنت اور ضعفِ سلطنت اور زوالِ سلطنت اور آخر کار ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے جیسے جیسے صدمے پہنچے، وہ ان کو سیکڑوں برس تک پنپنے نہ دیتے، مگر یوں کہو کہ خدا کی کچھ ایسی مہر کی نظر تھی کہ انگریز حاکمِ وقت ہوئے اور ماں باپ اولاد کی کیا پرداخت کریں گے جو انھوں نے رعیت کی پرداخت کی اور ان کی عملداری میں رعیت اس قدر آسودہ ہوئی کہ کبھی کسی وقت میں نہ ہوئی ہوگی، لیکن مسلمانوں کی کچھ ایسی مت ماری پڑی کی یہ لگے انگریزوں سے بدگمانی رکھنے۔
>
> (نذیر احمد: دلی کے مسلمانوں کی سوسائٹی)

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی مشن سکول میں نہ سہی کہیں بھی انگریزی پڑھے اور اس کے خیالات بالکل ویسے کے ویسے رہیں جیسے فی زمانہ عام مسلمانوں کے ہیں....

> اس [سید صادق] کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہب کا یہ خیال کر رکھا ہے کہ اس میں اور دنیا میں اس طرح کا بیر ہے کہ دونوں جمع ہو ہی نہیں سکتے۔ خصوصاً انگریزی عملداری میں خدا نے بندوں کی مصلحت اس میں سمجھی کہ انگریزوں کو وقت کا بادشاہ کر کے دنیاوی دولت کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ باوجود یکہ نصاریٰ اہلِ کتاب بھی ہیں، ان کے ساتھ کھانا پینا، عیسائی، مذہب کی عورتوں سے نکاح کرنا کہ دنیا میں میل جول اور دوستی ملاقات کے یہی طریقے ہیں۔ قرآن میں ان سب باتوں کی اجازت صاف موجود ہے۔ نصاریٰ کی مدح بھی ہے اور یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ امن اور انصاف اور آسائش اور آزادی، غرض ہر طرح کی راحت جیسی ان کی عملداری میں ہے نہ کبھی ہوئی اور نہ اب کسی دوسری عملداری میں ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے مسلمان ہیں کہ ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔۔۔ جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان روز بروز مفلس اور ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔
>
> (نذیر احمد: دلی کے مسلمانوں کی سوسائٹی)

نذیر احمد کے یہ خیالات ان کے ناول ''رویاے صادقہ'' میں ظاہر ہوئے ہیں۔ان خیالات اور علی گڑھ سے وابستہ دیگر لوگوں کے خیالات میں دین اور دنیامیں اس تضاد کو ختم کرنے پر زور ملتا ہے جسے انگریز حکومت اور انگریزی اداروں سے مسلمانوں کے گریز میں 'دریافت' کیا گیا ہے۔مسلمانوں پر سب سے بڑا اعتراض ہی یہ ہے کہ وہ ہر دو میں فرق روا رکھتے ہیں۔دین اور دنیا اپنے وسیع اور اطلاقی مفہوم میں مذہب اور عقل ہیں۔ان دونوں کے تضاد کا خاتمہ علی گڑھ مکتبہء فکر کا اہم مقصد تھا۔نیز علی گڑھ تحریک نے ان دونوں کی جو درجہ بندی کی تھی اس میں اوّلیت عقل کو دی گئی۔یہی وجہ ہے کہ عقل کی روشنی میں مذہبی اعتقادات کی توجیہ کی گئی۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مقصد خالص علمی نہیں تھا۔اس پر سیاسی اغراض کا سایہ صاف دکھائی دیتا ہے۔عقل کی فوقیت کا تقاضا تھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں جو کچھ ہورہا تھا،اسے انسانی تاریخی عمل سمجھا جاتا۔ہر واقعے کو انسانی عزائم اور مقاصد کی روشنی میں سمجھا جاتا،مگر یہاں اکثر واقعات کو خدا سے منسوب کیا گیا ہے۔مسلمانوں کے ادبار کا باعث ،خدا کا غصہ ہے اور ہندوستان پرانگریزوں کی عملداری بھی خدا کا کرم ہے۔نو آبادیاتی صورتِ حال کے تمام پہلوؤں کی توجیہ میں جب مابعدالطبیعیاتی علت پیش کر دی جائے تو اختلاف ومزاحمت کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے اور تسلیم و رضا اور تعاون وفرماں برداری کے جذبات فروغ پانے لگتے ہیں۔خدا سے بندے کی لڑائی ہوسکتی ہے!!

اس نصابی کتاب میں ترکی اور علی گڑھ یورپ کی تقلید کے نمایندہ ہیں اور دونوں کو مسلمانوں کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ترک اور ہندوستانی مسلمانوں کی ''ناگفتہ بہ'' صورتِ حال کی تشخیص و وضاحت کے لیے 'تعصب' کا لفظ بار بار استعمال کیا گیا ہے۔انیسویں صدی میں تعصب عام طور پر اس معنی میں رائج نہیں تھا،جس میں سرسید اور نذیر احمد خاص طور پر استعمال کرتے ہیں۔یہ عام طور پر ''حمایت،طرف داری،مذہبی رعایت'' کے مفاہیم میں برتا جاتا تھا۔اور یہ کم وبیش وہی مفہوم تھا جو ابن خلدون نے اسے دیا تھا۔'' لبغض للہی''اس کا غالب اور عام فہم مفہوم نہیں تھا۔بعض انگریزی لغت نگاروں نے اسے Prejudice کے متبادل کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تھا(مثلاً پلیٹس کے لغت میں)۔عربی کے اثر سے اردو میں تعصب ایک مثبت قومی خصوصیت تھی،اپنی اجتماعی حیثیت سے جڑے رہنے کی ایک جذباتی تدبیر تھی،مگر اب وہ ایک ایسی جذباتی ہٹ دھرمی میں بدلتی دکھائی دیتی ہے جو''یورپ کا طریقہ'' اختیار کرنے میں بری طرح حارج ہوتی ہے۔چناں چہ ان سب لوگوں کو متعصب قرار دیا جانے لگتا ہے جو پرانی لکیر کے فقیر ہیں؛دین اور دنیا کو الگ الگ رکھتے ہیں؛تعلیم رکھتے ہیں،تربیت نہیں؛اپنی ترقی سے غافل ہیں۔نیز اس تعصب کی شکل میں خدا کی نامہربانی مسلمانوں کی طرف رجوع کیے ہوئے ہے۔اس تعصب سے نجات کا ماڈل ترکی اور علی گڑھ ہیں۔سلطان عبدالحمید کی تاریخی اور سید صادق کی فکشنی شخصیات ہندوستانی مسلمانوں کے لیے رول ماڈل ہیں۔

> اگر سلطان محمود ان تعصّبات کو نہ چھوڑتا اور سلطان عبدالحمید اس طریقہ کو جسے سلطان محمود نے اختیار کیا تھا،ترقی نہ دیتا تو آج روسیوں کے حملے کے سبب ترکوں کا اور مسلمانوں کا دنیا پر نام ونشان نہ رہتا اور خدا جانے جزیرہء عرب میں کیا ہوتا۔اس کے بعد سلطان عبدالعزیز نے جو اس سے بھی زیادہ بے تعصب طریقہ اختیار کیا ہے،اگر ایسا نہ کرتا تو سلطنت جس تاریکی اور تباہی کی حالت میں پڑی تھی،ممکن نہ تھا کہ اب تک غرق نہ ہوجاتی۔ان تینوں بادشاہوں کو یورپ کا طریقہ اختیار کر کے ان جاہل متعصب ترکوں کے الزام اور بے وقوف اور ناسمجھ مولویوں اور قاضیوں کی لعنت ملامت سے بچنا نہایت مشکل تھا مگر جو علما کہ عقل مند اور بے تعصب تھے ،انھوں نے لوگوں میں ان تمام چیزوں کو

جن کو سلطان چاہتا تھا اور جن کے بغیر ترقی مسلمانوں کی غیر ممکن تھی، جائز، درست اور عین مطابق شرع بتلایا اور خود سلطان نے اور تمام لوگوں نے ان کو اختیار کیا۔۔۔بہ ہر حال تعصب خود خلافِ شریعت ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس میں گرفتار ہیں۔خدا کی نا مہربانی ان کی طرف رجوع ہے۔وہ اب مثل یہود کے ذلیل و خوار ہونے والے ہیں۔پھر اس کا علاج کیا ہے کہ خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔

(خطوطِ سرسید)

وہ[سید صادق] ہندوستانی سوسائٹی میں پیدا ہوا۔ ہندوستانی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی ،مگر اس نے ہوش سنبھالا علی گڑھ کالج میں۔۔۔پس حقیقت میں وہ ہندوستانی سوسائٹی کے قابل نہ تھا اور نہ ہندوستانی سوسائٹی اس کے لائق۔اس کی طبیعت ڈھونڈتی تھی وہی کالج کی صحبتیں کہ پڑھنا ہے تو ،اور باتیں ہیں تو،اور کھیل ہے تو،تمام وقت کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہے اور شغل بھی مفید اور دل چسپ ،تعلیم کی تعلیم اور تفریح کی تفریح۔ ہندوستانیوں میں اگر ایسے مذاق ہوتے یہ روزِ بد ہی کیوں پیش آتا۔

(نذیر احمد: دلی کے مسلمانوں کی سوسائٹی)

اس کتاب میں اس مشکل کا حل نہیں کہ اگر تاریخ کی علت سماجی ،انسانی نہیں، مابعدالطبیعیاتی ہے: مسلمانوں کا ادبار اور انگریزوں کی حکومت خدا کی طرف سے ہے؛ایک خدا کا غصہ اور دوسری خدا کا فضل ہے۔۔۔تو مسلمان اپنی صورتِ حال کے ذمے دار کیسے ہوسکتے ہیں ۔نیز اگر انگریز خدا کے فضل کی علامت ہیں تو پھر وہ امن، آسائش، ترقی، انصاف کیوں نہیں،جن کی کمی کا رونا رویا جا رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کا مابعد الطبیعیاتی تصور،تضادات سے معمور ہوتا ہے۔سماجی صورتِ حال کی علت خود سماج میں دیکھنے کے بجائے 'ماورا' میں دیکھی جانے لگتی ہے تو انسانی ذمے داریوں کا تعین اوّل تو ممکن ہی نہیں ہوتا اور اگر اس طرح کی کوشش کی جائے تو تردید و تضاد کی پے بہ پے صورتیں سامنے آنے لگتی ہیں۔اگر یہ سمجھا جائے کہ جو کچھ ہوتا ہے،خدا کی طرف سے ہوتا ہے تو خدا کی مرضی و منشا اور تاریخ میں خدا کی فیصلہ کن مداخلت پر سوال قائم نہیں کیا جا سکتا۔دوسری طرف کسی ایک عہد کی سماجی و تاریخی صورتِ حال کی تفہیم ،اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ اس پر سوال قائم نہ کیے جائیں،ذمے دار عوامل و اشخاص کا تعین نہ کیا جائے۔اس بنا پر کئی تضادات جنم لیتے ہیں۔مثلاً جس ''خدا'' کو علت قرار دیا جاتا ہے ،وہ ایک وحدانی تصور نہیں ہوتا۔ایک ہی خدا ،جس تاریخی مقام پر اپنے فضل کا مظاہرہ کرتا دکھایا جاتا ہے،اسی مقام پر غضب کا اظہار کرتا بھی دکھایا جاتا ہے۔خدا طاقت کے کھیل کا ایک کردار بن کر رہ جاتا ہے۔

اس کتاب میں عبد الماجد دریا بادی کے ڈرامے'' زود پشیماں'' کا ایک حصہ شامل ہے۔یہ متن سررشتہ ءتعلیم کی ہدایات کے برعکس نظر آتا ہے۔یہ متن واضح طور پر اس امر کا پر زور اثبات کرتا ہے کہ نو آبادیاتی برصغیر استعماری تدبیروں کا پردہ چاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس میں یورپ اور یورپی طرز کے ہندوستانی اداروں اور لوگوں کا کہیں تمسخر اڑایا گیا ہے اور کہیں ان کی برتری کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ہر چند یہ اوسط درجے کا ڈراما ہے،مگر نو آبادیاتی سیاق میں اس کی خاص اہمیت ہے۔یہ اہمیت اس قدر قابل توجہ ہے کہ اس کی ادبی حیثیت سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔سرسید اور ان کے اکثر رفقا کے ادبی متون اگر 'یورپ اور

یورپی طرز کے لیے تعاون و انجذاب کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں تو دریا بادی کا ''زود پشیماں'' یورپ اور یورپی طرز کے خلاف مزاحمت کا ستعارہ ہے۔ برطانوی سامراج نے برصغیر میں یورپ کو ایک کبیری بیانیے کے طور پر پیش کیا: یورپ سے متعلق ہر شے، برصغیر کے مقابلے میں برتر، اہم اور معنی خیز تھی۔ کسی شے کے اہم ہونے کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ یورپ سے متعلق ہے۔ یورپ ایک مرکزی تنظیمی اصول تھا۔ کیا قیامت ہے کہ ایک خیال آپ کی زبان سے ادا ہو تو کوئی اس پر اعتنا نہ کرے، لیکن وہی خیال جب یورپ کے کسی فاضل کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو لوگ اس پر آمنا و صدقنا کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

خیال کی اہمیت خود خیال کے بجائے، اس کو پیش کرنے والے کی نسبت سے متعین ہونے لگے تو اس کی سادہ وجہ یہ ہے کہ سیاسی طاقت نے جسم کے ساتھ ذہن ہی تسخیر نہیں کر لیا، سیاسی طاقت نے خود کو ایک ایسے علامتی نظام میں بھی منقلب کر دیا ہے، جو اپنی کارفرمائی میں مابعد الطبیعیاتی سرایت گیری کا حامل ہے۔ یہ اپنے عمل میں کم و بیش اسی طرح ہے جس طرح خدا یا ظل الٰہی ہوتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک ملک کے سپاہی دوسرے ملک کے سپاہیوں کو مغلوب کر لیں تو وہ اس ملک کے حاکم ہو جاتے ہیں لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ یہ فتح مندی محض سطحی اور یہ حکمرانی بالکل اوچھی ہوتی ہے۔ اصلی حکومت وہ ہوتی ہے جو محکوم جماعت کی جائدادوں اور جانوں پر نہیں، بلکہ اس کے افکار و خیالات، جذبات و معتقدات اور دل و دماغ کے قویٰ پر ہوتی ہے۔ یورپ نے ایشیا کو اسی طرز پر مسخر کرنا چاہا اور آپ دیکھتے ہیں، وہ اس کوشش میں کس حد تک کام یاب ہو گیا۔

اس ڈرامے میں ڈاکٹر اے بیسٹی کا کردار اپنے محدود اور واضح مفہوم میں علی گڑھ کا کیری کیچر ہے اور اپنے علامتی اور نسبتاً پھیلے ہوئے معانی میں اس نفسیاتی مظہر کا عکاس ہے جو یورپ کی تقلید کے اندھے جوش میں اور اس سے حاصل ہونے والے ثمرات سمیٹنے کے غیر تنقیدی عمل میں از خود مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ ڈرامے کا مرکزی کردار یوسف، نواب باقر حسین سے ملتا ہے، جہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر اے بیسٹی سے ہوتی ہے۔ نواب باقر حسین نے اسے اپنی بیٹی کا ٹیوٹر مقرر کیا ہے۔ نواب صاحب اس کے تعارف میں کہتے ہیں کہ ''نہایت قابل آدمی ہیں۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ سالہا سال علی گڑھ کالج میں بسر کیے ہیں۔ کیمبرج کے گریجوایٹ ہیں۔ امریکہ کا ال ال ڈی ہیں۔ طریق تعلیم ان کا بالکل جرمن اصول پر ہے، یعنی کتابی خواندگی کم اور زبانی تعلیم زیادہ۔'' جب یوسف ڈاکٹر اے بیسٹی سے ملتا ہے تو اس پر کھلتا ہے کہ اصل نام عبدالباسط تھا۔ اسے اٹالین کرتے ہوئے، عبدل کو الما اور باسط کو Baste کر دیا۔ اس طرح اے بیسٹی بن گیا۔ عبدالباسط کے ماموں آنریری اسسٹنٹ کلکٹر تھے؛ خوب روپیہ کمایا۔ بھانجے کو بیرسٹری کے لیے لندن بھیجا۔ کئی برس یورپ رہا، لیکن امتحان میں کبھی شریک نہ ہوا۔ کئی برس بعد کیمبرج یونیورسٹی جوائن کی اور وہاں سے اردو میں بی اے پاس کیا۔ ماموں پر رشوت کا مقدمہ چلا۔ ساری جائداد وکیل کو دے دی۔ پھر امریکہ کی پرائیویٹ یونیورسٹی کو پانچ سو روپے ماہوار بھیج کر ال ال ڈی کی ڈگری لی۔ (یہی کچھ آج بھی امریکہ میں ہوتا ہے۔) یوسف اس ساری کہانی پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

افسوس، دنیا کس قدر ظاہر پرست ہے اور اسے دھوکا دینا کس قدر آسان ہے۔ ایک شخص جہالت کا پتلا ہے، مگر علی گڑھ، کیمبرج اور امریکا کے نام سے دنیا کو مرعوب کیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر اے بیسٹی کا کردار اپنی اصل میں مضحکہ خیز ہونے کے باوجود کیوں لوگوں کو متاثر کرتا ہے، یعنی لوگوں کو کیوں اس کی

مضحکہ خیزی نظر نہیں آتی ؟ اس کی ایک وجہ وہ یورپی کردار ہیں جن کی نمایندگی طاقت کے بے مثال مظہر کے طور پر ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یورپ کو کبیری بیانیے کے طور پر فروغ دینے میں اس 'نمایندگی' کا اہم کردار ہوتا ہے۔چوں کہ کبیری بیانیے میں یورپ کو مسلسل اور تمام ممکنہ زاویوں سے غالب دکھانے کی کوشش ہوتی ہے ، اس لیے یورپ کی تقلید سے پیدا ہونے والی مضحکہ خیزی بالعموم نظر نہیں آتی۔دل چسپ اتفاق ہے کہ اسی کتاب میں نذیر احمد کے ناول میں ایک ولایتی کا کردار ہے، جو صاحب عالم کے پروردہ پہلوانوں سے کشتی لڑتا ہے۔نذیر احمد کا بیان سنیے:

ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھیرتی تھی۔آدمی کاہے کو تھا،ایک دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے۔چار پانچ گز سے مست دنبے کی سی بو،ایسی سخت کہ ناک نہ دی جائے۔پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔۔۔خوں خوار آنکھیں۔ڈراؤنی صورت۔۔۔بارے لوگوں نے ولایتی سے کہا کہ آغا ان لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمھارا جی چاہے کشتی لڑو۔۔۔''آغا ہم سب کے ساتھ لڑے گا''۔۔۔اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا کہ خیر ایک کی دارو دو۔استاد شاگرد سارے کا سارا کھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔جو داؤ پیچ یاد تھے،سبھی نے چلائے۔آغا ہیں کہ قطب از می جانمی جنبد۔لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ان لوگوں نے نادانی یہ کی کہ آغا سے گتھ گئے۔اس نے موقع پر ایک کو تو بغل میں دابا اور دوسرے کو دوسری بغل میں۔اس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی دبایا تھا مگر ان میں کا ایک تو آج تک کوب لیے پھرتا ہے اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔

والایتی پہلوان اور اس کا صاحب عالم کے پروردہ پہلوانوں کو شکست دینا علامتی ہے۔نذیر احمد کا بیانیہ یہ واضح کرنے میں کام یاب ہے کہ ولایتی نا قابل شکست ہے؛اس سے گتھنے والے نادان ہیں؛اس سے لڑنے کی 'نادانی' کرنے والے نمونہ ءعبرت ہیں:ایک کوب لیے پھرتا ہے اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔ان بیانات میں ہندوستانی تاریخ کی بعض کروٹیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

ہر چند کتاب کے تمام مندرجات کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کے لسانی تشخص کی ذیل میں اردو پر اصرار کرتے محسوس ہوتے ہیں،تاہم سرسید کے محسن الملک کے نام خط میں اسے وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے یہاں جداگانہ لسانی تشخص ابھارنے کی کوششیں ہونے لگی تھیں۔ اسی صدی کے اواخر میں ان کوششوں کے نتائج سامنے آنے لگے۔ہندو،ہندی کو اپنی زبان قرار دینے لگے اوراردو کے مقابلے میں اسے لانے لگے۔ہندوستان جیسے کثیر اللسانی ملک میں زبان کی بنیاد پر قومی شناخت کا سوال اپنے اندر تصادم کی کئی صورتیں لیے ہوئے تھا۔ہندی اردو تنازع میں ایک زبان یا دو زبانیں،اصل کون،مشتق کون،جیسے سوالات تصادم نہیں پیدا کرتے تھے۔تصادم اس وقت پیدا ہوتا تھا جب انھی سوالات کو قومی شناخت کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جاتا تھا۔زبان ، مذہب ،نسل ،جغرافیہ کسی بھی عنصر کو قومیت کی تشکیل میں فیصلہ کن عنصر قرار دینے کا نتیجہ تصادم اور نفرت ہی ہوتا ہے۔سرسید کے خط میں اس کی جانب اشارہ ہے:

ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو و خطِ فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے،مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو کے ہندی میں ہو۔ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو

مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا،مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ مسلمان علیحدہ ہو جاویں گے۔

سرسید کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان دو قومی نظریے کے تحت تقسیم ہوا۔ دو قومی نظریے کی تہ میں مذہبی اور لسانی تشخص نہ صرف بہ یک وقت موجود تھے بلکہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔لسانی تشخص فقط لسانی نہیں، مذہبی معاملہ بھی تھا۔ سرسید کا یہ خط ایک طرف انیسویں صدی کے اواخر کی لسانی صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے اور دوسری طرف مسلمان طلبا کے یہاں 'مذہبی لسانی تشخص' مستحکم کرنے کی سعی کرتا ہے۔

شہنشاہ ریڈر: حصہ چہارم [یعنی ہندوستانی کامن لینگوئج ریڈر کا حصہ چہارم]

سید تجمل حسین و پنڈت مدن موہن دیکشت

تعداد صفحات :۲۰۸ پریمیر پبلشنگ ہاؤس ،بار ہفتم ،۱۹۴۶ء،لکھنو

تمہید و ہدایات برائے مدرسین کے علاوہ نثر و نظم کے ۵۳ اسباق پر مشتمل ہے،جن کی فہرست یہ ہے:

۱۔ خدا کی بڑائی (نظم) ۲۔ پانی ۳۔ چائے ۴۔ اچھے مویشی

۵۔ پھول اور پھل ۶۔ کمرے کی صفائی ۷۔ مگر کا شکار ۸۔ گراموفون

۹۔ شہد کی مکھی ۱۰۔ ہمارا ہندوستان (نظم) ۱۱۔ چٹور پن ۱۲۔ پودا کیسے پیدا ہوتا ہے

۱۳۔ اسکاؤٹ ۱۴۔ مٹی ۱۵۔ سرسید احمد خاں ۱۶۔ انگور کھٹے ہیں(نظم)

۱۷۔ چیچک ۱۸۔ طرح طرح کی زمین ۱۹۔ گاؤں کا میل جول ۲۰۔ آگ (نظم)

۲۱۔ سانپ ۲۲۔ پودے کی جڑ ۲۳۔ چاند ۲۴۔ کانچ ۲۵۔ ماں کی نصیحت

۲۶۔ لالچ کا پھل ۲۷۔ کھیتی کے اوزار ۲۸۔ انگریزی راج کے فائدے ۲۹۔ بڑی بات (نظم)

۳۰۔ پودے کا تنہ [تنا] ۳۱۔ گوتم بدھ ۳۲۔ گرمی کا موسم ۳۳۔ سورج

۳۴۔ کتاب کی کہانی اسی کی زبانی ۳۵۔کشمیر ۳۶۔ سب سے اچھا دیس ہمارا (نظم) ۳۷۔باغ لگانا

۳۸۔سری کرشن اور سداما ۳۹۔ قلم اور تلوار(نظم) ۴۰۔ اخبار ۴۱۔ کسان اور لکھائی پڑھائی

۴۲۔ رامائن کی کہانی ۴۳۔ سب سے اچھی کسرت ٹہلنا ۴۴۔ریڈ کراس ۴۵۔ مہا دیو گوبند رانا ڈے

۴۶۔ طاعون یا پلیگ ۴۷۔ وقت پر کام کرنا ۴۸۔شیخی کی بڑائی (نظم) ۴۹۔ دنیا کے بڑے بڑے کام

۵۰۔ مقناطیس ۵۱۔ باغ کی سیر(نظم) ۵۲۔ مختلف دھاتیں ۵۳۔کوئی نہیں ہے غیر(نظم)

شہنشاہ ریڈر کے ہر حصے میں تمہید و ہدایات برائے مدرسین کا ایک ہی متن دیا گیا ہے جس کا خلاصہ حصہ اوّل کے تعارف و توضیح میں دے دیا گیا ہے۔

فہرست کے فوراً بعد ایک رنگین تصویر دی گئی ہے،جس کے نیچے اردو اور ہندی میں لکھا ہے؛''بچو ! یہ تمھارے شہنشاہ اور ملکہ ہیں۔'' یہاں اردو کے ساتھ ناگری رسم الخط کا استعمال ،ہندوستانی کامن لینگوئج کے تصور کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔ اصولی طور پر کامن لینگوئج کا رسم الخط بھی کامن ہی ہونا چاہیے۔شہنشاہ اور ملکہ کی تصویر سے یہ بات فی الفور سمجھ آ جاتی ہے کہ کتابوں کے اس سلسلے کو شہنشاہ کا نام کیوں دیا گیا ہے۔یہ کتابیں شہنشاہ کی طرف سے ہندوستانیوں کو تحفہ ہیں؛یہ کتابیں اتنی ہی بلند مرتبہ ہیں جتنے شہنشاہ (اور ملکہ) ہیں؛ان کتابوں کے مندرجات کو شہنشاہ کی اشیر باد حاصل ہے؛ہندوستانی بچوں کا تصور کائنات شہنشاہ اور ملکہ کے بغیر نامکمل ہے۔

کتاب کے ۴۲ نثر پاروں میں تین کہانیاں (مگر کا شکار،لالچ کا پھل اور چٹور پن) اور باقی تمام مضامین ہیں۔پانچ مضامین (سرسید احمد خاں،گوتم بدھ،سری کرشن اور سداما،رامائن کی کہانی،مہا دیو گوبند رانا ڈے) تاریخی اور دیگر چونتیس مضامین معلوماتی ہیں۔ان میں سے کچھ زراعت سے متعلق، کچھ فطرت،وطن،حکومت وقت،صحت و صفائی،پابندی وقت کے بارے میں اور چند سائنسی ایجادات و معلومات سے متعلق ہیں۔ہندوستانی کامن لینگوئج کے تصور سے شائبہ ہوتا ہے کہ کتاب میں جو سوانحی و تاریخی مضامین ہوں گے وہ مسلمانوں اور ہندووں دونوں کے مشاہیر سے متعلق ہوں گے یا پھر ہندوستان کے ان مشاہیر کے بارے میں ہوں گے جو دونوں مذہبوں کے لوگوں میں یکساں مقبول ہیں،مگر ایسا نہیں ہے۔مسلمان مشاہیر میں سے فقط سرسید کا انتخاب کیا گیا ہے اور غالباً پہلی مرتبہ سکول کی کسی درسی کتاب میں سرسید کا سوانحی تعارف دیا گیا ہے۔باقی تمام مشاہیر ہندووں کی قدیم اور جدید تاریخ سے لیے گئے ہیں: گوتم بدھ،سری کرشن اور سداما،رام اور مہا دیو گوبند۔کیا اس سے یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانی تاریخ میں مسلمانوں نے کوئی بڑی شخصیت پیدا نہیں کی،سوائے سرسید کے جسے بچے رول ماڈل بنا سکیں؟دوسری طرف اس امر سے یہ خیال تقویت پکڑتا ہے کہ ہندوستانی کامن لینگوئج کے تصور میں ہندوستانی سے مراد جو مشترکہ زبان اور تہذیب لی گئی ہے اس میں دونوں تہذیبوں کا حصہ یکساں نہیں بلکہ ایک تہذیب غالب ہے۔

سرسید کو بچوں کے رول ماڈل کے طور پر کیوں پیش کیا گیا ہے، اس کا جواب مضمون کے مندرجات سے ہو جاتا ہے۔سرسید ایک ہمہ جہت شخصیت تھے ؛انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے تعلیمی،مذہبی ،علمی اور ادبی خدمات انجام دیں،مگر اس سبق میں سرسید کی حیات سے ان واقعات کا انتخاب خاص طور پر کیا گیا ہے جو یورپی سرکار سے ان کی وفاداری اور جاں نثاری سے متعلق ہیں اور انہی جذبات کا فروغ چوتھی جماعت کے طالب علموں میں بھی مقصود تھا۔'' غدر کے دنوں میں انھوں نے بہت سے انگریزوں کی جان بچائی،جس بنگلے میں انگریز تھے ، اس کے آس پاس بندوق لے کر پہرا دیتے تھے۔جب انگریز گھبراتے،تب وہ کہتے،میرے ہوتے آپ کا بال بیکا نہیں ہوسکتا۔۔۔وہ بڑے نڈر اور ہمت والے تھے۔روہیلوں کے سردار محمود خاں نے بہت سے انگریزوں کو گھیر لیا۔سردار ان گھرے ہوئے انگریزوں کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔سرسید فوراً پہنچے ،مگر محمود خان کے پاس جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔جب پہرے دار نے آگے بڑھنے نہ دیا تو چلا کر کہا کہ میں تو پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں،قلم میرا ہتھیار ہے۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے ۔پھر پہرے دار نے روکا ،مگر محمود خاں نے بلا لیا ۔سرسید نے اس خوبی سے بات چیت کی کہ محمود خاں مان گیا اور ان گھرے ہوئے انگریزوں کو چھوڑ دیا اور راستہ کے خرچ کو روپیہ بھی دیا۔'' سرسید کی زندگی کے دوسرے اہم واقعات کو پیش نہیں کیا گیا جو ان کی قومی خدمات سے متعلق تھے۔ان کی طرف محض یہ اشارہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ کالج بنایا۔یہ سبق یہ باور بھی کراتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی دو حصوں میں بٹے تھے:ایک بڑا حصہ انگریزوں کے خلاف تھا اور ایک اقلیتی گروہ ان کی حمایت میں

تھا۔انگریز حکم رانوں نے ان لوگوں کو باغی ،دشمن قرار دیا جو اپنے ہم وطنوں کے شانہ بہ شانہ انگریزی فوجوں کے خلاف لڑے اور انھیں سخت سزائیں دیں مگر ان لوگوں کو ہیرو کا درجہ دیا جنھوں نے ان کی جانیں بچائیں یا ان کی سپاہ بن کر خود اپنے ہم وطنوں کے خلاف لڑے۔انھی لوگوں کو خطابات، جاگیروں سے نوازا گیا۔سرسید نے جاگیر تو نہ لی مگر ''غدر'' ختم ہونے کے بعد سرکار نے خلعت اوردوسوروپے ماہوار پنشن دی اور بعد ازاں کے سی ایس آئی کا خطاب دیا۔

ایک پورا مضمون 'انگریزی راج کے فائدے' شامل کتاب ہے۔یہ مضمون بھی اسی تیکنیک کے تحت لکھا گیا ہے جسے ''انتخاب و حذف اور تقابل وتفریق'' کا نام دینا چاہیے۔یعنی کچھ واقعات اور عناصر کا انتخاب ،کچھ دوسرے واقعات کے حذف کی بنیاد پر ہو اور منتخب واقعات کا تقابل ،ماضی کے واقعات سے ہو۔چناں چہ اس سبق میں انگریزی راج کے وہ فائدے ایک ایک کر کے گنوائے گئے ہیں جو پہلی حکومتوں میں نہیں تھے۔مثلاً امن، آمدو رفت کی سہولیات،ڈاک، رسل و رسائل ،علاج اور تعلیم وغیرہ۔یہ چند اقتباسات دیکھیے:

انگریزی راج سے ہمارے ملک کو بہت آرام پہنچا ہے۔اس راج سے پہلے ملک کی حالت خراب تھی ۔ڈاکو اور ٹھگ راستہ چلتے لوگوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔۔۔اب انگریزی راج کی وجہ سے ہر جگہ امن ہے۔ نہ چوروں کا ڈر ہے نہ ڈاکوؤں کا۔نہ لڑائیاں ہوتی ہیں اور نہ لوٹ مار۔پہلے زمانے میں ملک کے ایک حصے میں تو اناج اگر بہت زیادہ بھی ہوتا تو دوسرے حصے میں نہ جا سکتا تھا۔کبھی کبھی تو کہیں ایسا کال پڑ جاتا کہ لوگ بھوک سے مر جاتے تھے اور دوسرے صوبوں کے لوگ انھیں اپنا بچا ہوا اناج نہ پہنچا سکتے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے بچے ایک ہی جگہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں اور جو دل لگا کر پڑھتا ہے اسے انعام ملتا ہے۔سرکار بڑے عہدے دیتی ہے۔انگریزی راج سے ہمیں بہت سکھ پہنچا ہے۔

کتاب میں ایک مضمون چائے پر بھی ہے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ اقبال اور حکیم شجاع کی مئولفہ درسی کتاب میں چائے کی مخالفت میں ایک مضمون شامل کیا گیا ہے،مگر اس کتاب میں چائے کی حمایت میں۔چائے کی مخالفت طبی نقط نظر سے کی گئی ہے،جب کہ اس کی حمایت تجارتی بنیاد پر کی گئی ہے۔اقبال اور حکیم شجاع کی کتاب پنجاب کے سکولوں کے لیے تھی اور زیرِنظر کتاب شمالی ہندوستان کے صوبوں (ممالک) کے سکولوں کے لیے تالیف کی گئی جہاں چائے کی تجارت ہوتی تھی۔''دنیا کی آدھی سے زیادہ چائے ہمارے ملک میں پیدا ہوتی ہے،لیکن اب چائے کے باہر بھیجنے میں کمی ہوگئی ہے اور ہر سال ۴۰ لاکھ من سے زیادہ چائے باہر نہیں بھیجی جا سکتی۔اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں چائے کی تجارت کو ترقی دی جائے جس سے لاکھوں آدمی جو اس کی کھیتی میں لگے ہوئے ہیں بیکار نہ ہو جائیں۔''اصل یہ ہے کہ یہ درسی کتابیں اس 'تاجرانہ سیاست' میں شریک نظر آتی ہیں جو نو آبادیاتی برصغیر میں انگریز حکم رانوں کی طرف سے جاری تھی۔چائے بھی اس سیاست کا حصہ تھی۔چاے کی مخالفت کے ذریعے ہندوستان میں اس کی کھپت کم کر کے اس کی برآمد بڑھا کر زیادہ سے زیادہ زر مبادلہ کمانا تھا،جس کا فائدہ بہ ہر حال انگریز حکم رانوں اور دولتِ برطانیہ کو ہونا تھا۔

حصہ نظم میں شامل منظومات میں دو نظمیں (انگور کھٹے ہیں اور گرمی کا موسم) مولوی شفیع الدین نیر کی لکھی ہوئی ہیں۔باقی تمام مئولفین کی ہیں۔ان منظومات میں چند ایک اخلاقی موضوعات پر ہیں باقی میں مشترکہ تہذیب کا تصور پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کی

منظومات سے ظاہر ہونے والے مشترکہ تہذیبی تصور پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو عناصر سے عبارت ہے: ارضِ ہندوستان سے محبت اور مذہبی رواداری۔ یہ دونوں عناصر نظموں میں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ 'ہمارا ہندوستان' اور 'سب سے اچھا دیس ہمارا' میں ہندوستان کا فطری اور جغرافیائی جمال اجاگر کر کے یہ نکتہ ابھارنے کی کوشش ملتی ہے کہ اتنی حسین دھرتی محبت کے قابل ہے۔ یہ محبت ہی مذہبی تفریق بالائے طاق رکھنے کی بنیاد بن سکتی ہے۔

اتر ہے جو ہمالہ پیارا　　پورب برہم پتر کی دھارا
پچھّم سندر سندھ کنارا　　دکھن میں ہے سمندر سارا

ہے یہ ہندوستان ہمارا

ہندو مسلم اور عیسائی　　جینی، پارسی اور سکھ بھائی
آپس میں کیوں کریں لڑائی　　سب کو اپنا دیس ہے پیارا

ہے یہ ہندوستان ہمارا

یہی خیالات 'سب سے اچھا دیس ہمارا' میں پیش ہوئے ہیں:

ہند میری آنکھوں کا تارا　　ہند ہے سب کو دل سے پیارا
سب ملکوں کا راج دلارا　　بلکہ یہی دنیا کا سہارا

سب سے اچھا دیس ہمارا

ہائے یہ کیا دل میں ہے سمائی　　لڑتے ہیں کیوں بھائی بھائی
ملک کی کرتے مل کے بھلائی　　جس سے ہوتا اپنا گزارا

سب سے اچھا دیس ہمارا

اسی طرح نظم 'کوئی نہیں ہے غیر' میں بھی مذہبی فرقہ واریت کو ترک کرنے پر زور ملتا ہے۔ یہاں بھی اس نکتے پر ارتکاز ہے کہ اگر 'بھارت ماتا کو سب اپنی ماتا' تسلیم کر لیں تو باہمی مذہبی اختلافات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ نیز اس نظم میں بھگتی شعرا کے صلح کل اور مسجد مندر کی بجائے اپنے من میں ڈوب کر خدا پانے کے مسلک کی تعلیم دی گئی ہے۔

کوئی نہیں ہے غیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

ہندو مسلم سکھ عیسائی　　دیکھو سبھی ہیں بھائی بھائی
بھارت ماتا سب کی ماتا　　گنگا دیوی سب کی مائی

مت رکھ من میں بیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

بھارت کے سب رہنے والے　　کیسے گورے کیسے کالے

چھوت چھات کے جھگڑے پالے پڑگئے جس سے جان کے لالے

کاہے کا یہ بیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

رام سمجھ رحمان سمجھ لے دھرم سمجھ ایمان سمجھ لے

مسجد کیسی مندر کیسا ایشور ہی کا استھان سمجھ لے

کر دونوں کی سیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

سوچے گا کس پن میں بابا کیوں بیٹھا ہے بن میں بابا

خاک ملی کیوں تن میں بابا ڈھونڈ لے ا س کو من میں بابا

مانگ سبھوں کی خیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

دھن دولت میں من اٹکایا کاہے باسط جی للچایا

سب سے نرالی تیری مایا کرتا ہے کیوں اپنا پرایا

ناحق کا یہ بیر بابا کوئی نہیں ہے غیر

نو آبادیاتی سیاق میں دیکھیں تو ان نظموں میں ایک گہری سیاسی حکمت عملی کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔اوّل یہ احساس دلایا گیا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے ہندوؤں،جینیوں،مسلمانوں،سکھوں،عیسائیوں،پارسیوں میں مذہبی اختلافات ہیں۔پھر انھیں یہ درس دیا گیا ہے کہ وہ باہمی اختلافات،ارضِ ہندوستان کی محبت پیدا کر کے ختم کرنے کی کوشش کریں۔حکمتِ عملی یہ تھی کہ ہندوستانی باہمی اختلافات کا شعور حاصل کرنے اور انھیں مٹانے کی کوششوں میں مصروف رہ کر اس سیاسی اور سماجی شعور سے دور رہیں گے جو انھیں ایک غیر ملکی اور استحصالی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک دیتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ان کے یہاں ''غیر'' کا تصور خود انہی میں سے پھوٹے گا؛''غیر'' کو ایک دشمن کے طور پر وہ خود اپنے درمیاں ہی دیکھیں گے۔لہٰذا وہ اپنے سدھار کی مساعی میں مصروف رہ کر آزادی کی تحریکوں کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں کہیں یہ اشارہ تک موجود نہیں کہ ہندوستان پر خود ہندوستانی حکم ران نہیں ہیں اور ان کا معاشی،سیاسی،ثقافتی استحصال کیا جا رہا ہے۔ایک اہم ترین اور بنیادی قومی سچائی،جس کی تپش ہر خاص و عام محسوس کر رہا تھا،اس کا سایہ تک ہندوستان کے دریاؤں پہاڑوں کی محبت میں لکھی جانے والی نظموں پر پڑتا دکھائی نہیں دیتا۔

طریقۂ تعلیم زبان اندر نرائن اوستھی

تعداد صفحات :۳۹۲ نول کشور پریس،بار دوم، ۱۹۴۶ء لکھنو

اندر نرائن اوستھی (بی۔اے۔ایل ٹی،ہیڈ ماسٹر سنٹرل ٹریننگ اسکول نرول،کان پور) نے یہ کتاب نارمل اور ٹریننگ سکولوں کے متعلم مدرسین کے لیے تالیف کی تھی۔کتاب تمہید و دیباچے کے علاوہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ کہانی ۲۔ تصاویر کی ضرورت ۳۔ لڑکوں کو سنانے کے قابل بہ طور نمونہ چند کہانیاں

۴۔ ڈراما سے فوائد ۵۔ گفتگو کے مقاصد ۶۔ لڑکوں کے گیت اور لوریاں ۷۔ سامعہ کی تربیت اور مشق
۸۔ پڑھنا ۹۔ طریقہ تعلیم حروف تہجی ۱۰۔ لکھنا ۱۱۔ خوش خوانی ۱۲۔ قواعد
۱۳۔ انشا پردازی ۱۴۔ کتب غیر درسیہ کی تعلیم

تمہید کی ذیل میں بی۔این ۔جھا،ڈی۔پی ۔کھتری اور گوگل سہائے شری واستو نے کتا ب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے ہیں اور مصنف کی طرف سے دیباچہ ہے۔تمہید میں زبان کی تدریس کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔''چوں کہ ورنا کیولر زبان ہی ہماری مادری زبان ہے، اس لیے اس کے طریقہ ءتعلیم کو سب سے پہلے عمدہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔''زبان کے علم کی درسی اہمیت واضح کرتے ہوئے بی۔این ۔جھا نے لکھا ہے:'' زبان کی معلومات کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا،اتنا ہی اپنے خیالات کو دوسروں پر ظاہر کرنے اور دوسروں کے مطالب کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس کی تنگی دیگر مضامین کی خامیوں کا سبب بنے گی۔''یہ تصور آج بھی اہمیت رکھتا ہے۔چوں کہ تمام علم (سائنسی ،تاریخی،انسانیاتی)زبان میں وجود رکھتا ہے ،اس لیے زبان پر قدرت ،علم پر قدرت کی شرطِ اوّلین ہے۔ کتاب کے مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ وہ''اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں پیدا کر سکا۔۔۔جو کچھ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ان کم زور ہاتھوں نے لکھا ہے،وہ سب انھیں مغربی ممالک کے استادوں کی باتیں ہیں۔۔۔ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے بالکل آنکھیں بند کر کے ان کی کورانہ تقلید نہیں کی۔''لہٰذا زبان کی تعلیم سے متعلق مغربی نظریات کی تلخیص کتاب میں ملتی ہے۔

کتاب کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان کی تدریس کا آغاز ایک طرف حروف تہجی سے ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں قواعد سے لے کر شعرو کہانی کی اصناف تک شامل ہیں۔تاہم زبان کے نقطہءنظر سے ان ادبی اصناف کی تدریس کرتے ہوئے ،ان کے خالص ادبی تصور کو تحلیل کرنا پڑتا ہے۔اس کی صورت عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ ادبی تصور جن عناصر سے مرتب ہوتا ہے ،ان کی درجہ بندی بدل دی جاتی ہے۔مثلاً'' کہانی کہنا علم اورفن دونوں ہے،لیکن فن کا نمبر اوّل اور علم کا نمبر دوم ہے۔۔۔مگر مدرسہ میں دوسرے مقصد کی طرف سے بالکل عدم توجہی نہیں کی جا سکتی۔'' گویا ادب کی فنی حیثیت تدریس میں ثانوی رہ جاتی اور اس کے ذریعے ''لسانی، اخلاقی، معاشرتی اور اس نوع کی دیگر معلومات'' کی ترسیل زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔'' مدرسوں میں قصہ اور کہانی کہنے کا خاص مقصد طلبا کی معلوماتِ زبان میں اضافہ کرنا ہے۔''یعنی'' لفظوں ،جملوں اور مفید محاوروں کا علم۔''لیکن جب تدریسی زاویہءنظر ادب کے فنی یا جمالیاتی پہلو پر اس کے علمی یا حوالہ جاتی پہلو کو فوقیت دیتا ہے تو یہیں سے ادب کے سیاسی،آئیڈیالوجیکل استعمال کی راہ کھل جاتی ہے۔چناں چہ کہانی کی تدریس کے اس مقصد پر زور دیا جانے لگتا ہے کہ''اخلاقی تعلیم کے خیال سے تو قصہ لازمی اور لابدی ہے۔''دل چسپ بات یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم بذریعہ قصہ کہانی کی عقلی توجیہ بھی کر دی گئی ہے۔ اخلاق کا تعلق قوتِ تمیز سے ہے۔اچھے اور برے کے امتیاز کے بغیران میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کیا جاسکتا۔قصہ کہانی اس امتیاز اور انتخاب کے قابل بناتی ہے۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ لوگوں کا تصور کائنات انھی کہانیوں سے تشکیل پاتا ہے جو روایت اور تعلیمی نظام کے ذریعے ان تک پہنچتی ہیں۔انسانی شخصیت اور چیزوں، آدمی،خدا،حکومت سے متعلق زاویہءنظر کی تعمیر میں ان کہانیوں کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔اس لیے تعلیمی نصابات میں کہانیوں کا انتخاب کافی سوچ بچار کے بعد کیا جاتا ہے۔اس کتاب میں کہانی کی تدریسی اہمیت کے

ساتھ کہانی کے انسانی ذہنی نشوونما سے تعلق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مؤلف واضح کرتے ہیں کہ قصہ کہانی سے قوتِ متخیلہ کی ترقی ہوتی ہے۔تخیل کی دو قسمیں ہیں: ترکیبی اور اختراعی۔'' ابتدا میں تخیل ترکیبی کام میں آئے گا یعنی بچے قصے سنیں گے اور بیان کی تصویر صفحۂ دل پر کھینچتے چلیں گے۔ بعد ازاں اونچے درجات میں تخیل اختراعی عمل میں آئے گا،یعنی لڑکے محض اشاروں کی مدد سے۔۔۔اپنی طبیعت سے خود قصہ بنائیں گے۔'' مگر سوال یہ ہے کہ بچوں کا جب تخیل اختراعی کام میں آنے لگتا ہے تو کیا وہ اس اثر سے آزاد ہو جاتے ہیں جو تخیل ترکیبی کے تحت کہانیوں کی قرأت نے پیدا کیا تھا؟ ترکیبی اور اختراعی تخیل کا یہ فرق بڑی حد تک وہی ہے جسے بالترتیب قوتِ متصورہ اور قوتِ متخیلہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔قوت متصورہ ،حسی تجربات کو ان کی اصل شکل میں محفوظ رکھتی ہے ،جب کہ قوتِ متخیلہ اس مواد میں ترتیبِ نو پیدا کرتی ہے۔لہٰذا تخیل اختراعی ، تخیل ترکیبی کے بعد کی منزل ضرور ہے ، مگر اس سے یک سر الگ نہیں ہے۔بڑی حد تک تخیل اختراعی انھی کہانیوں میں ردو بدل کرتا ہے جو تخیل ترکیبی نے محفوظ کی تھیں۔اس کا اطلاق ہم تخلیقی عمل پر نہیں کر سکتے۔ وہاں تخیل اختراعی ،کالرج کے تخیل ثانوی کے بمنزلہ ہوتا ہے جو معلوم کو توڑ پھوڑ کر، انھیں گوندھ کر، بے ہیئت کر کے قطعی نئی شکلیں پیدا کرتا ہے۔ اس تخیل کی نمود نو آبادیاتی عہد میں خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ ایک اپنا ،منفرد اور حاوی تصورات کے برعکس 'تخیل' ایک نئی ،استحصال و جبر سے آزاد دنیا کا خواب تخلیق کر سکتا ہے لہٰذا اس کی بیخ کنی کی سعی کی جاتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ نو آبادیاتی عہد میں تخیل کے جتنے مباحث ہمیں (حالی،شبلی کے یہاں) ملتے ہیں ،ان میں تخیل غیر معمولی اختراعی صلاحیت کا حامل نہیں۔ جہاں اس صلاحیت کا شائبہ ہوتا ہے وہاں تخیل کو قوتِ ممیّزہ کے تابع رکھنے پر زور ملتا ہے۔ بہ ہر کیف تدریس میں کہانی کے کردار کی یہ بحث،ہمیں نو آبادیاتی عہد کے نصابات میں مخصوص کہانیوں کے انتخاب اور ان کے فنی سے زیادہ علمی پہلوؤں پر زور دینے کا سبب سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

پرنس ریڈر: حصہ چہارم

قاضی سید نصیرالدین و بابو مینو دھن لال سریواستو

تعداد صفحات :۲۵۸ مطبع نول کشور،لکھنو،۱۹۴۷ء

کتاب میں نظم و نثر پر مشتمل ۵۵ اسباق شامل ہیں،جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ہندو مسلم ایک ہیں دونوں (نظم)	۲۔ پنا کی بہادری	۳۔ کچھ کام کی باتیں (۱)
۴۔ کچھ کام کی باتیں(۲)	۵۔ لالچ کا برا پھل	۶۔ بیل (نظم)
۷۔ اپنا دیس	۸۔ کولمبس(۱)	۹۔ کولمبس(۲)
۱۰۔ سائنس کی انوکھی باتیں	۱۱۔ باغ کی سیر(نظم)	۱۲۔ چھپا خزانہ
۱۳۔ گوتم بدھ	۱۴۔ کچھ کام کی باتیں(۳)	۱۵۔ کچھ کام کی باتیں(۴)
۱۶۔ بڑے کون کہلاتے ہیں(نظم)	۱۷۔ خوبصورت چڑیاں	۱۸۔ جگدیش چندر بوس
۱۹۔ میٹھے بول	۲۰۔ چیونٹی	۲۱۔ آزادی(نظم)
۲۲۔ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنا	۲۳۔ چمڑے کا کاروبار	۲۴۔ سچی سیوا

۲۵۔ پلیگ	۲۶۔ چاند	۲۷۔ لوگ کیسے رہتے ہیں(۱)
۲۸۔ لوگ کیسے رہتے ہیں (۲)	۲۹۔ لوگ کیسے رہتے ہیں (۳)	۳۰۔ گوپال کرشن گوکھلے
۳۱۔ لکھنو کی نمائش(نظم)	۳۲۔ ڈاک وتار	۳۳۔ گیند بلا(نظم)
۳۴۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونا	۳۵۔ چھٹی	۳۶۔ پل
۳۷۔ برائی کا بدلہ	۳۸۔ پھلوں کی کھیتی	۳۹ بہادر اسکاؤٹ
۴۰۔ ریل	۴۱۔ ہوائی جہاز	۴۲۔ کام کی چڑیاں
۴۳۔ چاپے	۴۴۔ سنترہ (نظم)	۴۵۔ ہندو تیوہار
۴۶۔ خربوزہ(نظم)	۴۷۔ دوسروں کی مدد کرنی چاہیے	۴۸۔ ماں
۴۹۔ آم کا باغ لگانا	۵۰۔ گلاب کا پھول(نظم)	۵۱۔ الہ آباد
۵۲۔شیر	۵۳۔ جگنو(نظم)	۵۴۔ شہنشاہ جارج پنجم ۵۵۔بہادر لڑکے (نظم)

کتاب کے متن کے آغاز سے پہلے ملکہ ایلزبتھ اور شہنشاہ جارج پنجم کی تصاویر ہیں (جیسے شہنشاہ ریڈرروں میں ہیں)۔ان تصاویر کی معنویت اسی کتاب میں درج ایک اقتباس کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔''حواس خمسہ میں قوت باصرہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کا اثر دل و دماغ پر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔اسی خیال سے ان کتابوں میں زیادہ تعداد میں خوب صورت اور معنی خیز خاص طور سے تیار کرا کر سبقوں کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔''

کتاب کے دیباچے میں اس سلسلہء ریڈر کے مقاصد اور ان کے حصول کے طریق کار کے ضمن میں کئی اہم باتیں درج ہیں جو ہندوستان میں ورنیکلر تعلیم کے سلسلے میں بھی بڑی حد تک درست ہیں۔مثلاً پہلی اہم بات یہ کہ''ہمارے صوبہ کے سررشتہء تعلیم نے کامن لینگوئج ریڈروں کے لیے مضامین اسباق مقرر کر دیے ہیں۔ان کے مطابق کتابیں لکھی گئی ہیں۔'' گویا تمام ریڈروں اور نصابی کتابوں کی تالیف کے لیے وسیع اور عمومی ہدایات نہیں ہوتی تھیں،جن میں مئولف اپنی انفرادی رائے سے کام لے سکتا اور کسی موضوع و مضمون کو شاملِ کتاب کر سکتا جسے وہ طلبا کی ذہنی نشوونما کے لیے ضروری سمجھتا۔مئولف کا علم و تجربہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اور اس علم و تجربے کی معنویت اس کی نظر میں یا اس تصورِ کائنات کے مطابق جس سے اس کا تعلق ہے، کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، وہ انھی ہدایات کا پابند رہنے پر مجبور تھا، جو سررشتہء تعلیم نے طے کر دی تھیں۔مئولف کی حیثیت نہ تو ایک تخلیق کار کی تھی، نہ ایک عالم کی، بلکہ ایک ایسے پیشہ ور کی تھی جو حسبِ منشائے حکامِ تعلیم اپنی مہارت ،علم اور تجربے کو بروے کار لاسکتا ہے۔۔۔دوسری اہم بات دیباچے میں یہ رقم ہے کہ'' ان [ریڈروں] کی زبان عام فہم اور روزانہ بول چال کی ہے ۔چاروں ریڈروں میں گنتی کے ہی چند الفاظ ایسے ہیں جو ہندی اردو کی کتابوں میں الگ الگ ہیں،ورنہ اس ہندوستانی کا استعمال کیا گیا ہے جس کو ہر شخص بولتا اور سمجھتا ہے۔'' اس سے کامن لینگوئج کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔یعنی ایسی زبان جو نہ تو فوق ہندی (High Hindi) ہے نہ فوق اردو (High Urdu)۔یہ دونوں زبانیں ،ایک ہی اصل زبان پر پیوند کی گئی زبانیں تھیں۔ایک نسبتاً مفرس و معرب تھی اور دوسری اسی نسبت سے

سنسکرت زدہ تھی۔عوام کی زبان ایک ہی تھی، جسے ہندو مسلم سب سمجھتے تھے۔لہٰذا کامن لینگوئج سے مراد وہی زبان ہے، جسے اب ''نئی ہندی''اور'' نئی اردو'' بے دخل کر رہی تھی۔اس سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ کامن لینگوئج کا رخ ،اشرافیہ کے بجائے عوام کالانعام کی طرف تھا۔''ہر شخص بولتا اور سمجھتا ہے'' سے مرادشمالی ہندوستان کے عام و خاص ،تمام لوگ نہیں۔''ہر شخص''میں اعلیٰ طبقے کے ہندو مسلمان نہیں بلکہ متوسط اور نچلے متوسط طبقے اور نئی زبان میں حاشیے پر موجود ہندو مسلم ہیں۔۔۔تیسری اہم بات یہ ملتی ہے کہ ''حسب ہدایات سررشتہ ءتعلیم ان کتابوں میں تقریباً کل اسباق جدید لکھے گئے ہیں۔۔۔مختلف درجوں کے طلبا کی عمروں کے لحاظ سے ان کے دماغی قوا کے مطابق مشکل یا آسان اسباق لکھے گئے ہیں۔پہلے حصے میں مکالمہ کے سبق زیادہ ہیں۔تیسرے اور چوتھے درجے کی کتابوں میں غورطلب اسباق زیادہ ہیں۔'' تیسرے اور چوتھے درجے کے طالب علم ،محکمہ ءتعلیم کے ان افسروں کے لیے بے حد اہم تھے جو نصابی کتابوں کے لیے مضامین متعین کرتے تھے، اس لیے کہ'' ان درجوں کے لڑکوں میں غوروخوض کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔''نو آبادیاتی عہد کے محکمہ ءتعلیم کے لیے یہ ایک بے حد نازک مسئلہ تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نپٹا جائے جب طالب علم غوروخوض کے قابل ہوتے ہیں ؛ان کی قوتِ ممیّزہ اور قوتِ متخیلہ بیدار ہوچکی ہوتی ہے۔اس 'سٹیٹ اپریٹس' کو ادراک تھا کہ غوروخوض کوئی مجرد عمل نہیں۔غوروخوض ہمیشہ کسی معروض پر ہوتا ہے:معروض مناظر و مظاہر بھی ہو سکتے ہیں اور متن بھی۔یہ بھی سمجھا گیا کہ معروض اور غوروفکر میں رشتہ قائم ہونے کے بعد جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جیسا معروض ہو گا ویسے ہی جذبات پیدا ہوں گے۔چناں چہ دیباچے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ''ان درجوں کے لڑکوں میں حب وطن،اطاعت بادشاہ،امداد باہم دگر،ہم دردی، رحم دلی، انسانیت وغیرہ کے جذبات پیدا کرنے کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔گرام سدھاراور خدمتِ خلق پر بہت سے اسباق ہیں۔المختصر ہمارا مدعا ہے کہ طلبا میں جذبات پیدا کرکے ان کی زندگی کو مفید و برتر بنایا جائے اور جب وہ سن بلوغ کو پہنچیں تو اپنی اور اپنے دوست احباب کی ترقی کے ہمیشہ کوشاں رہیں۔''ان کتابوں کے ذریعے طلبا میں جن جذبات کو پیدا کرنا مقصود تھا، ان میں کچھ تو عمومی اخلاقی اور معاشرتی جذبات ہیں،جیسے رحم دلی، امداد باہمی وغیرہ مگر جن جذبات کو اوّلیت دی گئی ہے وہ حبِ وطن اور اطاعتِ بادشاہ ہیں۔ان ریڈروں میں دونوں طرح کے جذبات ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ بادشاہ کی اطاعت ہی وطن کی محبت ہے یا اگر وطن سے محبت کا دعویٰ ہے تو اس کی دلیل بادشاہ کی فرماں برداری ہے۔اسے محض اتفاق نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں کی عظمت بیان کرنے کے لیے یکساں طور پر پرشکوہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔دونوں کو اپنی عظمت میں بے مثال قرار دیا گیا ہے۔وطن اپنے فطری نظاروں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے اور بادشاہ اپنے راج کی وسعت اور پرجا کے لیے سکھ اور ترقی کے مواقع پیدا کرنے کی وجہ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔مثلاً اسی کتاب میں شہنشاہ جارج پنجم پر ایک سوانحی مضمون شامل ہے ۔اس کی عظمت کا بیان دیکھیے :

دنیا کے ملکوں میں اب تک کوئی بادشاہ اتنا بڑا نہیں ہوا جس کی بادشاہ[بادشاہت] جارج پنجم کے ساتھ برابری کی جاسکے اس کا راج اتنا بڑا تھا کہ اس میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا تھا۔۔۔بادشاہ جارج کے وقت میں انگریزی راج کی اتنی زیادہ ترقی ہوئی جتنی سیکڑوں سال میں بھی نہ ہوسکتی تھی۔ان کی پرجا کو ہر طرح کا سکھ ملااور ترقی کے نئے راستے کھلے۔اس بڑے بھاری انگریزی راج میں سب لوگ سکھ اور آرام سے رہے۔

کتاب میں شامل ۴۰ نثری تحریروں میں تین کہانیاں (پنا کی بہادری،لالچ کا برا پھل اور چھپا خزانہ)،دس سوانحی ،تاریخی مضامین (کولمبس ۱،۲،گوتم بدھ،جگدیش چندر بوس،میٹھے بول، سچی سیوا،گوپال کرشن گوکھلے،اپنے پیروں پر کھڑا ہونا،برائی کا بدلہ،شہنشاہ

جارج پنجم) اور باقی تمام مضامین سائنسی معلوماتی ہیں۔

وطن کی محبت اور بادشاہ کی فرماں برداری اور اس سے وفاداری،ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔یہ خیال'پنا کی بہادری' میں زور دار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔پنا''راجپوتانہ کے میواڑ راج کے راجہ مہا رانا سانگا کے چھوٹے لڑکے اودے سنگھ کی دائی تھی۔سانگا کی موت کے بعد وکرما دت داس کا بڑا بیٹا راجہ بنا، نالائق تھا۔اسے راج کے سرداروں نے اتارا،چھ برس کے اودے سنگھ کو راج کمار مقرر کیا،مگر اس کے بڑے ہونے تک بن بیرا کو راج کا کام سونپ دیا۔بن بیر کی نیت بگڑ گئی۔اس نے اودے سنگھ کو قتل کرنے کا ارداہ کیا۔ایک رات جب پنا اودے سنگھ کو پنکھا جھل رہی تھی اور دوسری چارپائی پر اس کا بیٹا جس کی عمر اودے سنگھ جتنی تھی،سویا ہوا تھا،تو ایک نوکر نے اسے بتایا کہ''پنا ان کنور کی خیر نہیں۔بن بیر تلوار لے کر اسے مارنے ادھر آیا ہے۔''اس بہادر عورت نے طے کر لیا کہ ایسے وقت میں کیا کرنا چاہیے۔وہ جھٹ دوسری کوٹھڑی سے ایک بڑا ٹوکرا اٹھا لائی اور اس میں سوتے ہوئے اودے سنگھ کو لٹا کر اوپر سے ردی ،کپڑے اور کوڑا کرکٹ بھر دیا۔اس نوکر سے بولی کہ تم جھٹ اس ٹوکرے کو لے کر قلعے کے باہر نکل جاؤ۔میں ابھی آ کر تم سے ملتی ہوں''۔۔۔بن بیر آیا۔اس نے ڈپٹ کر پوچھا''پنا بتا اودے سنگھ کہاں ہے؟''اس نے اکلوتے بیٹے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔بن بیر نے ایک ہی ہاتھ میں بچے کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔بے چاری پنا اپنے بیٹے کے لیے رو بھی نہ سکی۔ پنا ڈری کہ کہیں بھید نہ کھل جائے اور راج کمار بھی نہ مارا جائے۔اس لیے اپنے پیارے لڑکے کو وہیں مرا ہوا چھوڑ کر پنا محل سے نکلی اور راج کمار کو لے کر چتور سے رخصت ہوئی۔۔۔کنبھل میر کے سردار نے اودے سنگھ کو بچانے کا وعدہ کیا اور اسے اپنے یہاں رکھ لیا۔جب وہ بارہ سال کا ہو گیا تو یہ بھید کھل گیا۔چتور کے سب سردار اپنے اصلی راجہ کو پا کر بہت خوش ہوئے۔اسے گدی پر بٹھایا۔بن بیر راج گدی چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔اس کہانی سے جو اخلاقی سبق اخذ کیا گیا ہے وہ مئولف کے لفظوں میں سنیے:'' پنا نے اپنے مالک کی جان بچانے میں جو بہادری دکھائی،اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔اپنے اکلوتے بیٹے کی بھینٹ دے کر اس نے راج کمار کو بچایا۔اس سے اس کا نام دنیا میں امر ہو گیا۔''ہندوستانی تاریخ سے ماخوذ یہ بیانیہ متن'نو آبادیاتی سیاسی عرصے' میں استعمال کیا گیا ہے اور اسے ایک خاص معنویت دی گئی ہے۔یہ متن افراد کی جان ، مال،اولاد،آبرو سب کو ریاست اور بادشاہ(دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے) کی ملکیت قرار دیتا ہے۔چوں کہ بادشاہ کی ملکیت ہے ، اس لیے بادشاہ ان میں مداخلت کر سکتا، انھیں اپنے تصرف میں لا سکتا،حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر ان کی قربانی طلب کر سکتا ہے۔چوں کہ افراد اپنی جانوں، مال اور اولاد کے مالک نہیں ، بلکہ ریاست کی ملکیت کے محض''امین'' ہیں اس لیے وہ عندالطلب ان میں سے کسی شے کو پیش کرتے ہوئے ماتھے پر بل نہیں لاتے۔پنا اپنے بیٹے کی موت پر اس لیے نہیں روئی کہ وہ اس کا نہیں ریاست کا''مال''تھا جس کی وہ امین تھی اور جس کا ٹھیک'' مصرف''اس نے کیا۔ٹھیک یہی مفہوم مضمون''اپنا دیس'' میں صاف لفظوں میں پیش کیا گیا ہے۔''اپنے ملک کی بھلائی کے لیے لوگ جان تک دے دیتے ہیں۔اسی لیے پنا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی ہتیارے کے ہاتھ میں سونپتے وقت ماتھے پر بل نہ آنے دیا۔چتور کے بہادروں نے اپنے دیس کو بچانے کے لیے ہزاروں اپنی جانیں نچھاور کر دی تھیں اور بہادر عورتیں ہنسی خوشی آگ کی لپٹوں سے لپٹ گئی تھیں۔لنگٹن جیسے بہادر انگریز اپنے ملک کے لیے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر لڑائی کی آگ میں کودے تھے۔''

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ تاریخی اور فکشنی بیانیے'' انتخاب و ترجیح'' سے کام لیتے ہیں۔انتخاب و ترجیح مواد کی جمع آوری میں بھی بروے کار آتے ہیں اور مواد کی ترتیب اور کسی خاص نکتے کو''نقطہ ء ارتکاز'' بنانے میں بھی۔مثلاً جب اپنے دیس پر قربان ہونے

والوں کا انتخاب کیا گیا ہے تو ان لوگوں کو ترجیح دی گئی ہے جنھوں نے عہد انگریزی سے پہلے لڑائیوں میں اپنی جانیں دیں۔ہندوستان کے کتنے ہی لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جنگیں لڑیں اور اپنی جانیں قربان کیں،انھیں انتخاب سے باہر رکھا گیا ہے۔۱۸۵۷ء کے کسی ہندوستانی مجاہد کا ذکر نہیں۔پنا کا ذکر ہے جھانسی کی رانی کا ذکر نہیں۔اسی طرح ان بیانیوں کا نقطہ ء ارتکاز منتخب کرنے میں بھی خوب احتیاط اور سوچ بچار سے کام لیا گیا ہے۔پنا کی کہانی میں نقطہ ء ارتکاز، پنا بہ طور ماں نہیں، بہ طور دائی ہے؛ایک راجہ کے بیٹے کی ماں اور نگہبان۔اس لیے کہانی میں اس المیے کی طرف کوئی اشارہ نہیں جو اپنے سگے بیٹے کو،راجہ کے بیٹے پر قربان کرنے سے جنم لیتا ہے۔کہانی میں پنا کے انتخاب و فیصلے کے لمحے کو اس طور پیش کیا گیا ہے جیسے کہانی کے واقعات میں یہ ایک معمولی واقعہ تھا یعنی ایک چھوٹا اور معمول کا واقعہ۔

حصہ نظم میں اکثر نظمیں فطرت و معاشرت سے متعلق ہیں اور کچھ ہندوستان کی 'کامن تہذیب' کے تصور پر مبنی ہیں۔مثلاً کتاب کا آغاز ہی 'ہندو مسلم ایک ہیں دونوں' سے ہوتا ہے۔

ہندو مسلم دونوں ہیں بھائی　　بھارت ماتا ان کی مائی
ایک ہی گھر کے دونوں اجالے　　ایک ہی شہر کے رہنے والے
ایک ہی محلے میں بستے ہیں　　ایک ہی دونوں کے رشتے ہیں
شیر ہیں دونوں اک جنگل کے　　ہوئے جواں اس کھیت میں پل کے
راجوں کی اولاد ہیں دونوں　　بھارت میں آباد ہیں دونوں
پھول ہیں دونوں ایک ڈالی کے　　سینچے ہوئے ہیں ایک مالی کے
سیفی دل کے نیک ہیں دونوں
ہندو مسلم ایک ہیں دونوں

اگر ہم ان سب متون کو غور سے پڑھیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ 'ہندوستانی کامن لینگوئج' اور 'کامن تہذیب' کے تصورات دراصل قدیم ہندوستانی تاریخ میں بنیاد رکھتے ہیں۔ان کی 'اصل' قدیم ہے، لہٰذا ہندو مسلم دونوں کا ایک ہونا دراصل اسی قدیم 'اصل' سے جڑا ہونا ہے۔دوسرے لفظوں میں مسلم تاریخ و تہذیب اس تصور میں حاشیے پر ہیں۔اس کتاب کے تاریخی سوانحی مضامین میں کوئی ایک مضمون مسلمانوں کے مشاہیر پر نہیں۔اس امر کی مزید وضاحت کامن لینگوئج کے اسلوب سے ہو جاتی ہے۔رسم خط اردو ہے مگر ہندی الفاظ کی بھرمار ہے:

> ایک دن ایک راجہ اپنے محل میں پلنگ پر پڑا سو رہا تھا کہ خواب میں لکشمی جی اسے درشن دے کر کہا۔راجہ میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔جو جی میں آئے مانگ لے۔۔۔راجہ کی نیند اچٹ گئی وہ اٹھ بیٹھا۔اس نے پلنگ پر ہاتھ رکھا۔پلنگ سونے کا ہو گیا۔۔۔راجہ نے روتے روتے کہا۔دیوی! میں نے بڑی غلطی کی۔دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو سونے سے کہیں زیادہ اچھی ہیں۔ایشور کی کرپا سے وہ چیزیں میرے ساتھ تھیں،مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔میں اب آپ

سے یہی مانگتا ہوں کہ اب آپ اپنے پردان کو لوٹا لیجیے۔

ہر چند اس کے دفاع میں کہا جاسکتا ہے کہ کہانی کا کردار چوں کہ ہندو ہے، اس لیے اس کی زبان سے 'ہندی' الفاظ ادا کیے گئے ہیں۔لیکن سوچنے والی بات یہی ہے کہ ایسی کہانیوں کا انتخاب کیوں کیا گیا جن کے مرکزی کردار نہ صرف ہندو ہوں، بلکہ ان کہانیوں کا کوئی نہ کوئی رشتہ ان کے قدیم مذہب سے بھی ملتا ہو؟ایسی کہانیاں بھی ہوسکتی تھیں، جوکرداروں، واقعات اور تصورات کی سطح پر مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی نمایندہ ہوں۔ اس نکتے کی مزید وضاحت اس اقتباس سے ہو جاتی ہے:

> ہمارے ملک میں ایشور نے بار بار اوتار لیا ہے اور ہریش چندر جیسے سچے راجہ ہو گئے ہیں۔یہیں پر بکرمادت اور اکبر جیسے بڑے بڑے راجہ ،تان سین جیسے گویّا ،میرا بائی جیسی بھگت اور چشتی جیسے فقیر ہو گئے ہیں۔ہمیں اپنے دیس کی بھلائی اور ترقی کا ہمیشہ خیال رہنا چاہیے۔

ایشور کا اوتار لینا،خالص ہندو مذہبی تصور ہے۔اکبر اور معین الدین چشتی کو اوتار قرار دینا،قدیم ہندو تہذیب کی اصل کی روشنی میں برصغیر کی تہذیبی تاریخ کی تعبیرِ نو کے مترادف ہے۔تعبیر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر نئے اور پرانے متن کی تعبیر' مقامی اور موجود علم' کی روشنی میں کی جاتی ہے اور یہی اصول یہاں بھی کام میں لایا گیا ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ ہندو طالب علم تو مسلم شخصیات کے لیے احترام کے جذبات محسوس کرتا ہوگا کہ مسلمان مشاہیر کی شناخت اس کے مذہبی پیراڈئم کی روشنی میں کی جارہی ہے اور ان کی اجنبیت دور ہورہی ہے،مگراس طرف دھیان نہیں دیا گیا کہ مسلمان طالب علم کے لیے خود اس کے مشاہیر کی شناخت اجنبی ہورہی ہے۔اس کے لیے تو یہ تصور بھی محال ہوگا کہ کسی بھی شعبے کی تاریخ ساز شخصیت کی صورت میں ویشنو زمین پر آسکتا ہے۔لہٰذا یہاں 'مقامی اور موجود علم' سے مراد قدیم ہندی تہذیب کا علم ہے جو مشترکہ تہذیب کے بجائے فقط ہندی تہذیب کا تصور ابھارتا ہے۔

شہنشاہ ریڈر اوّل [یعنی ہندوستانی کامن لینگویج ریڈر کا حصہ اوّل]

سید تجمل حسین و پنڈت مدن موہن دیکشت

تعداد صفحات :۱۲۸ پریمیر پبلشنگ ہاؤس ، ۱۹۴۷ء لکھنو

سید تجمل حسین (لکچرر ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور پنڈت مدن موہن دیکشت کا باہمی اشتراک سے اس ریڈر کی تالیف کرنا کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ اس امر کی عملی شہادت پیش کرنا ہے کہ 'ہندوستانی کامن لینگویج' سے مراد ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔شہنشاہ اور پرنس کے نام سے تیار ہونے والی ریڈریں دراصل یہ اعلان ہیں کہ انگریز شہنشاہ ہندوستانیوں کی ترجمانی اور راہنمائی کا اقتداری حق رکھتا ہے؛نیز ان کے ذریعے ابتدائی جماعتوں کے طلبا کو یہ باور کرانا کہ شہنشاہ اور پرنس بزرگ و برتر ہیں۔ان ریڈروں میں فہرست مندرجات کے بعد شہنشاہ اور ملکہ کی رنگین تصویر بھی شامل ہوتی تھی۔اس کتاب میں ۴۴ مضامین نظم و نثر ہیں،جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔تصویروں سے لفظوں کی پہچان	۲۔کسان کا کھیت	۳۔بتاؤ میں کون ہوں	۴۔شیخ چلی
۵۔محنت کا پھل	۶۔کیڑا	۷۔کیلے والا (نظم)	۸۔بیل اور کتا
۹۔کام کرنے والا لڑکا	۱۰۔گاڑی کا چوکیدار	۱۱۔کنواں	۱۲۔ہمارے کپڑے

۱۳۔باغ کی سیر ۱۴۔ہرنی پر مہربانی کا بدلہ ۱۵۔آلو ۱۶۔مکھی

۱۷۔پھوٹ کا پھل ۱۸۔بڑھئی ۱۹۔اچھے لڑکے (نظم) ۲۰۔گلہری

۲۱۔میل ۲۲۔کسان کی دولت ۲۳۔برائی کے بدلے بھلائی

۲۴۔بندر ولا (نظم) ۲۵۔بازار ۲۶۔نوشیرواں ۲۷۔دودھ دینے والے جانور

۲۸۔آم ۲۹۔صبح (نظم) ۳۰۔رام داس کی صفائی ۳۱۔بھاما شاہ ۳۲۔تتلی

۳۴۔کوّا ۳۵۔گاؤں کی صفائی ۳۶۔سچائی ۳۷۔ہماری سواریاں ۳۹۔حضرت ابراہیم

۴۰۔ہمارا ہندوستان (نظم) ۴۱۔طوطا ۴۲۔اپنی مدد آپ کرو ۴۳۔سرگنگا رام

۴۴۔ہمارا مالک (نظم)

اس کتاب کی ایک خاص بات 'ہدایات برائے مدرسین' ہیں جنھیں کتاب کے شروع میں درج کیا گیا ہے۔یہ ہدایات دراصل وہ مقاصد بھی ہیں جن کا حصول اس کتاب کی تالیف و تدریس کا محرک ہے۔اس کتاب کی تدریس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ''لڑکوں کو ہندوستانی الفاظ سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ وہ سرکاری اطلاعات،کھیتی باڑی اور حفظان صحت کے محکموں کی ہدایات اور رپورٹیں بخوبی سمجھ سکیں اور ان کے متعلق اور دوسرے کاروباری معاملات کے متعلق اپنے خیالات بخوبی ظاہر کرسکیں۔''دوسرا مقصد یہ ہے کہ ''لڑکے صحیح تلفظ اور تغیر لحن کے ساتھ آسان عبارتیں بلند آواز سے اس طرح پڑھ سکیں کی سننے والے ان کا مطلب بخوبی سمجھ سکیں۔۔۔لڑکوں میں چپ چاپ تیزی سے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو۔''مئولفین کے پیش نظر ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ''انھیں[طلبا] پڑھنے سے ایسی دل چسپی پیدا ہو کہ وہ اسے اپنے لیے ایک اچھا مشغلہ خیال کرنے لگیں اور مدرسہ چھوڑنے پر بھی اخبار اور دوسری مفید اور دل چسپ کتابیں پڑھتے رہیں۔''لہٰذا یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس ریڈر کا بنیادی مقصد طلبا کو محض خواندہ اور مفید شہری بنانا تھا؛انھیں زندگی اور سماج سے متعلق غوروفکر کرنے اور پھر انھیں قبول یا تبدیل کرنے کے لیے اپنے کردار کو تعین کرنے کے قابل بنانا اس نصاب کا مقصد نہیں تھا۔

شہنشاہ ریڈرز کے سلسلے کی خصوصیات پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔مثلاً'' اس سلسلے کی زبان خصوصیت کے ساتھ سادہ ہے۔شروع میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت ہی آسان اور دل چسپ سبق لکھے گئے ہیں۔زبان کی تدریجی ترقی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔''یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس سلسلے کی ''کتابیں سلیبس کے کانٹے پر پورا اترتی ہیں۔اس کا اندازہ فہرست مضامین کے دیکھنے سے بخوبی ہوتا ہے۔''گویا ان کتابوں کے مندرجات مئولفین کی پسند نا پسند یا ترجیحاتِ ذاتی کی بجائے،شمالی ہندوستان کی سرکاری تعلیمی پالیسی کے عین مطابق ہیں۔اس پالیسی میں دیہی اور زرعی معاشرت پر خاص زور ملتا ہے۔چناں چہ کتاب کے ابتدائیے میں یہ واضح کرنا ضروری خیال کیا گیا ہے کہ ''کھیتی ہندوستان کا خاص پیشہ ہے اور دیہات کی زندگی کا دارومدار اسی کی ترقی پر منحصر ہے۔اسی لیے اس سلسلہ میں بہت سے اسباق زراعت کے متعلق دیے گئے ہیں۔'' نیز'' دیہات سدھار کے کام پر خاص زور دیا گیا ہے اور طلبا کو اس کام میں عملی حصہ لینے کا شوق دلایا گیا ہے۔''

شہنشاہ ریڈرز کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اسے اردو کا نام دینے کے بجائے ہندوستانی کامن لینگوئج کا نام دیا گیا۔ہندوستانی

کامن لینگوئج کا تصور، برطانوی نو آبادیاتی تصور تھا۔اٹھارویں صدی کے اواخر میں اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ گل کرسٹ نے بہ طورِ خاص استعمال کیا،تاہم بیسویں صدی میں جب اس کے ساتھ کامن لینگوئج کا اضافہ کیا گیا تو گویا ہندوستانی کو ایک نیا کردار سونپا گیا ۔اپنے علانیہ مقصد کی رو سے ہندوستانی کامن لینگوئج ہندو اور مسلم قومیتوں کے لیے یکساں لسانی قومی شناخت ابھارنے کا ذریعہ تھی،مگراسی عمل میں یہ زبان نو آبادیاتی حکم رانوں کے لیے اس بات کوممکن بناتی تھی کہ وہ ہندو اور مسلم قوموں کی ترجمانی کا منصب سنبھال سکیں اور پھر ان کی شناختوں میں مداخلت کرسکیں۔شمالی ہندوستان میں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں یہ بیانیہ رائج کیا گیا کہ'' ہندو مسلم اتحاد ملک کی بھلائی کے لیے نہایت ضروری ہے۔'' لہٰذا اس سلسلے کی ریڈروں میں ایسے اسباق شامل کے گئے جن سے بچوں میں میل جول بڑھانے کے موقعے ملتے ہیں۔انھیں ایک دوسرے سے محبت کرنے کا سبق ملتا ہے۔'' پوری کتاب انہی ہدایات وخصوصیات کی حامل ہے۔حضرت ابراہیم اور نو شیرواں پر مضامین اگر مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں تو رام داس کی صفائی، بھاما شاہ ،سرگنگا رام ہندووں کی ثقافتی شناخت کے نمائندہ ہیں۔ اسی طرح اکثر اسباق کے فرضی کرداروں کو ہندو اور مسلم نام دیے گئے ہیں۔نظموں میں ہندو مسلم اتحاد پر بہ طور خاص زور ملتا ہے۔مثلاً نظم 'ہمارا ہندوستان' کے یہ اشعار:

ہندوستاں ہے دیس ہمارا
جان سے اپنی ہم کو پیارا
ہندو مسلم اور عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی
بھائی کو ہو بھائی پیارا
ایسا ہوگا چلن ہمارا
حاصل کرکے علم اور دولت
دیس کی اپنے کریں گے خدمت
دیس کا مل کر کام کریں گے
جگ میں روشن نام کریں گے

کتاب میں جگہ جگہ ہم کا صیغہ ملتا ہے۔جس طرح ہندوستان کو ہمارا کہا گیا ہے اسی طرح خدا کو بھی ہمارا کہا گیا ہے۔زبان اور ملک کی طرح خدا کا بھی مشترکہ تصور ابھارا گیا ہے۔نظم 'ہمارا مالک' میں خدا کا ایک ایسا تصور پیش کیا گیا ہے جس کی کوئی مخصوص مذہبی شناخت نہیں ہے ۔

ایشور جو ہے وہی خدا ہے
پیدا اس نے سب کو کیا ہے

دھرتی سورج چاند بنایا
بادل سے پانی برسایا
کیسے اچھے پیڑ اگائے
ان میں پتے پھول لگائے
گائے بنائی بیل بنائے
جو ہم کے کام میں آئے
سمجھ دی اچھے برے کو جانیں
اپنے مالک کو پہچانیں

سلیبس کے کانٹے پر اترنے والی ان کتابوں کی تمہیدی تحریروں میں اس امر کا ذکر عام طور پر نہیں کہ یہ ہندوستانیوں میں حکومت کے لیے وفاداری جذبات پیدا کرنے کے لیے بھی تھیں اور یہ بات سلیبس کا اہم حصہ تھی۔اس کتاب کے بعض اسباق میں بھی نو آبادیاتی آئیڈیالوجی کو کہیں واشگاف اور کہیں مخفی انداز میں سمو دیا گیا ہے۔مثلاً 'بھاما شاہ'۔ یہ مہارانا پرتاب کی کہانی ہے،جس کی فوج تتر بتر ہوگئی تھی اور وہ جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔اس کے راج میں ایک سیٹھ تھا،جس نے کنجوسی سے کام لے لے کر کافی دولت جمع کر رکھی تھی۔اس نے یہ ساری دولت مہا رانا پرتاب کو دے دی ۔ اس نے اس رقم کی مدد سے پھر فوج اکٹھی کی اور اپنے دشمنوں کا سامنا کیا۔اس کہانی سے مؤلفین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:'' لڑکو ہمیں بھی اپنے بادشاہ کی خدمت کے لیے بھاما شاہ کی طرح تیار رہنا چاہیے۔''اگرچہ رانا پرتاپ کی کہانی اس مشترکہ تہذیب کے تصور پر ضرب لگاتی ہے جسے ان ریڈروں کے ذریعے فروغ دینے کی کوششیں کی جارہی تھیں کہ رانا پرتاپ نے کبھی اکبر کی ہندوستان پر حکومت کو جائز تسلیم نہیں کیا تھا؛مگر اس کہانی میں مرکزی کردار بھاما شاہ بنایا گیا ہے۔اسے بچوں کے لیے ایک رول ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ایک مقامی مثال کے ذریعے ہندوستانی بچوں میں اس قومی جذبے کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنی عمر بھر کی کمائی اپنے شہنشاہ کے قدموں میں ڈھیر کرنے سے دریغ نہ کریں۔فرد کے ملکیتی اثاثوں کا اعلیٰ ترین مصرف یہی ہے کہ وہ ریاست کے کام آئیں۔اس کی جان کی طرح اس کے مال پر بھی ریاست کا حق ہے ۔یہ آئیڈیالوجی ریاست کے روا اور نا روا ہونے پر سوال اٹھانے سے شہریوں کو باز رکھتی ہے۔

یہ ریڈر،پرنس ریڈر سے قدرے مختلف ہے کہ اس کی زبان میں ٹھیٹھ ہندی عناصر کا غلبہ نہیں اور شروع سے آخر تک یہ کوشش ملتی ہے کہ نہ تو اسے غیر ضروری طور پر مفرس بنایا جائے اور نہ سنسکرت زدہ کیا جائے۔

سواد اردو

[ٹیکسٹ بک برائے جماعت چہارم،مدارس ورنیکلر،سابق مجوزہ ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم عام ممالک متحدہ آگرہ و اودھ]
خاں صاحب مولوی محمد اسماعیل
تعداد صفحات :۱۰۸ مطبع نول کشور لکھنو،دفعہ بیس، ۱۹۴۷ء

چوتھی جماعت کے لیے اردو کی اس کتاب میں کل ۳۴ نظم و نثر ہیں۔فہرست مندرجات یہ ہے:

۱۔ رسم الخط مئولف ۲۔سلطان فیروز مئولف ۳۔خدا کی تعریف (نظم) مئولف

۴۔کوشش کیے جاؤ (نظم) مئولف ۵۔اہلیا بائی مئولف ۶۔پند سود مند (نظم) مئولف

۷۔سلطان ناصر الدین مئولف ۸۔میرا خدا میرے ساتھ ہے (نظم) مئولف

۹۔ریلوے انجن کا موجد جارج سٹیفن مئولف ۱۰۔جنگل اور چاندنی رات (نظم) میر حسن

۱۱۔تحمل اور وفائے وعدہ مئولف ۱۲۔آم کی تعریف (نظم) میر شیر علی افسوس

۱۳۔سلطان جلالدین مئولف ۱۴۔دو مکھیاں (نظم) مئولف ۱۵۔شیر شاہ سوری مئولف

۱۶۔بارش کا پہلا قطرہ (نظم) مئولف ۱۷۔سرکشی کا ثمرہ مئولف ۱۸۔ناقدردانی (نظم) مئولف

۱۹۔سیتا جی مئولف ۲۰۔عجیب چڑیا (نظم) مئولف ۲۱۔جلال الدین محمد اکبر مئولف

۲۲۔اشعار ذوق ذوق ۲۳۔خودرائی کا نتیجہ (نظم) مئولف ۲۴۔خدا کی قدرت مئولف

۲۵۔اکبر کی پیدائش آزاد ۲۶۔ہندوستان کے پھول (نظم) میر شیر علی افسوس ۲۷۔گفتگو نذیر احمد

۲۸۔تاروں بھری رات (نظم) مئولف ۲۹۔غرض کی دوستی مئولف ۳۰۔کاشتکاری (نظم) مئولف

۳۱۔بے غرض دوستی مئولف ۳۲۔آسمان اور ستارے (نظم) مئولف ۳۳۔محمود و ایاز مئولف

۳۴۔ کچھوا اور خرگوش (نظم) مئولف

مؤلف نے رسم الخط کی ذیل میں دراصل صحت تلفظ کی اہمیت جتائی ہے اور املا و تلفظ کے ان اصولوں کی وضاحت کی ہے جن کی پابندی مئولف نے اس کتاب میں کی ہے۔دو لفظوں کو ملا کر لکھ دینے کے رواجِ عام پر تنقید کی ہے ۔ ن، و ،ی کے حروف کی متعدد املائی صورتیں رائج رہی ہیں۔مولوی محمد اسماعیل نے زیرِ نظر کتاب میں یہ اصول اختیار کیا ہے کہ مثلاً واو معروف کے پہلے الٹا پیش لگا دیا جائے (دُور)؛ واو مجہول کے پہلے کوئی علامت نہ ہو (چور)؛ واو معدولہ کے نیچے سیدھی لکیر کھینچ دی جائے (خِوراک)؛ واو ماقبل مفتوح پر زبر لگا دیا جائے (عَورت)۔اسی طرح اوقاف و رموز کا خیال بھی رکھا ہے ،تاہم وہ مفرد اور مرکب جملے کا تصور رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک مرکب جملہ دراصل پیرا گراف ہے۔مفرد جملے کے لیے خط (-) کی علامت اور مرکب جملے کے آخر پر چار نقطے لگائے گئے ہیں۔

یہ کتاب ۱۶ نثر پاروں اور ۱۸ نظموں پر مشتمل ہے۔حصہ نثر میں ۱۲ مضامین تاریخی اور ایک تمثیلی ہے؛ دو حکایات ہیں اور ایک آداب گفتگو پر ہے۔کوئی معلوماتی یا سائنسی مضمون شامل نہیں کیا گیا۔ہر مضمون کسی نہ کسی اخلاقی نکتے کی تلقین کرتا ہے۔انصاف، نیکی،صبر و تحمل، محنت اور فرماں برداری جیسی اخلاقی اقدار کو پیش کیا گیا ہے۔تاریخی مضامین میں آٹھ کا تعلق ہندوستان کے بادشاہوں (سلطان فیروز،سلطان ناصر الدین،سلطان فتح خاں،سلطان جلال الدین، شیر شاہ سوری،جلال الدین محمد اکبر[دو مضامین]،محمود غزنوی) سے ہے؛ دو ہندوؤں کی تاریخ (اہلیا بائی اور سیتا جی) سے لیے گئے ہیں۔باقی دو مضامین یورپی تاریخ سے متعلق ہیں۔اس

طور مشترکہ تہذیب کا تصور پیش کیا گیا ہے۔تاہم اسی ضمن میں کچھ باتوں کا ذکر دل چسپی سے خالی نہیں۔اس مشترکہ تہذیب میں مسلمانوں کی تاریخ کو بادشاہوں کے سوانح کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اسے تاریخ کا پدری تصور بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں کی تاریخ کو مادری عناصر کا علم بردار بنا کر پیش کیا گیا ہے؛جب کہ یورپی تاریخ سے ایک سائنس دان کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس طرح یورپی تاریخ میں فکر و تحقیق کے عنصر کا اثبات کیا گیا ہے۔کیا ہندوؤں کی تاریخ سے اس لیے نسوانی ہیرو کا انتخاب کیا گیا ہے کہ مرد ہیرو مسلمان بادشاہوں سے نبرد آزما تھے اور ان نصابات کے ذریعے مشترکہ تہذیب کا تصور نمایاں کرنا مقصود تھا؟اس مشترکہ تہذیب کا دوسرا نام مذہبی ہم آہنگی ہے۔سندھیا کے خاندان کی اہلیا بائی کا ''سب سے افضل یہ وصف تھا کہ وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ زیادہ مہربانی سے پیش آتی تھی۔''اکبر کا شیوہ صلح کل تھا۔''ہر ملت و مذہب کے لوگوں کو اس کے ممالک محروسہ میں آزادی تھی۔سب اپنے اپنے طریق پر عبادت کرتے۔کوئی کسی کا مزاحم نہ تھا۔''اسی طرح اردو زبان کو بھی مشترکہ تہذیب کی علامت اور مظہر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔نذیر احمد کے مضمون ''گفتگو'' میں لکھا ہے:''یہاں کی اصلی بولی سنسکرت تھی۔پھر بھاکا بولنے لگے۔ اکبر بادشاہ کے وقت سے بہت بڑا لشکر رہتا تھا۔ان میں عرب، ہندوستان، ترکستان، فارس، ہر ملک کے آدمی نوکر تھے اور اپنے اپنے دیس کی بولی بولتے تھے۔مدت تک سب ساتھ رہے اور سب کی بولیاں گڈ مڈ ہو کر یہ نئی بولی پیدا ہوئی جو اردو ہے اور ہم تم بولتے ہیں۔پس اردو بولی اسی ملک سے نکلی ہے۔''

کتاب میں شامل ایک تمثیلی مضمون بہ عنوان ''سرکشی کا ثمرہ'' ہے۔نو آبادیاتی سیاق میں اس کی گہری معنویت ہے۔ اٹھارویں صدی کی یورپی تمثیل نگاری کو انیسویں صدی کے اواخر میں اردو میں رواج دینے کا آغاز ہوا تا کہ نو آبادیاتی تصور اخلاق کو ہندوستانی ذہن میں راسخ کیا جا سکے۔''سرکشی کا ثمرہ''میں بدن اور اس کے اعضا کی تمثیلی کہانی پیش کی گئی ہے۔تمام اعضائے بدن، معدے کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔''ہم کماتے کماتے تھک جاتے ہیں اور یہ نکھٹو معدہ مفت میں ہماری کمائی ہضم کر جاتا ہے۔'' چناں چہ ''پاؤں نے رفتار، ہاتھوں نے کاروبار ترک کیا، آنکھوں نے بصارت سے آنکھ چرائی، کان سماعت سے بے بہرہ ہوگئے۔ناک نے سونگھنا ،زبان نے چکھنا چھوڑ دیا۔'' نتیجہ کیا ہوا؟ سب لاغر و بے بس ہو گئے۔انجام کار معدے سے رجوع کیا،''بہت نادم و خجل ہوئے؛توبہ کی کہ آیندہ ایسی خطا نہ کریں گے۔''یہاں مئولف یا تمثیل کا ہمہ بین راوی تمثیل میں ظاہر ہوتا اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔'' اسی طرح جو نادان اپنے مربیوں اور آقاؤں کی اطاعت اور خدمت کو جبر سمجھتے ہیں، وہ انجام کار ایذا پاتے اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ ''تمثیل کے راوی نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ معدہ ،آقا اور مربی (یورپی) ہے،جب کہ باقی اعضائے بدن اطاعت گذار اور خدمت گار(ہندوستانی) ہیں۔اس تمثیل سے فقط یہی ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ اگر ہندوستانی یورپیوں کی اطاعت و خدمت کو جبر سمجھتے ہیں تو ان کی تقدیر میں ایذا اور نقصان ہی لکھا ہے، بلکہ اس امر کا اثبات بھی پیشِ نظر ہے کہ ہندوستانیوں کے حواسِ خمسہ (یعنی علم و عمل) کا انحصار یورپی آقاؤں پر ہے۔۱۹۴۰ء کی دہائی میں،جب یہ کتاب شایع ہوئی ہے،ہندوستان میں عدم تعاون ،سرکشی اور مزاحمت کی تحریکیں زور پکڑے ہوئے تھیں۔یہ واضح ہے کہ تمثیل کے مخاطب ان تحریکوں کے قائدین اور ان کے پیروکار ہیں ۔جن بچوں کو اس تمثیل کی تعلیم دی جارہی ہے وہ ممکنہ پیروکار ہیں۔ ان کے دل میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ان کے آقا ان کے حقیقی ہم درد ہیں، لہٰذا ان کے خلاف سرکشی نادانی ہے۔

حصہ نظم میں ایک حمدیہ نظم اور باقی اخلاقی اور قومی نظمیں ہیں۔اخلاقی نظموں میں محنت،صبر اور انکسار کے مضامین ہیں۔اس

نصابی کتاب میں قومی شاعری کا تصور ارضی اور جغرافیائی ہے۔چناں چہ ہندوستان کے فطری مناظر،ارضی مظاہر اور پرندوں پر نظمیں شامل ہیں جن کی سماجی اور سیاسی معنویت نہیں ہوتی۔کچھ نظمیں تو انگریزی سے ترجمہ ہیں اور باقی ان سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ نظموں کی زبان اور اسلوب دیکھنے کے لیے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کرے دشمنی کوئی تم سے اگر جہاں تک بنے تم کرو درگزر

(پند سودمند)

بڑے موذی کو مارا،نفس امارہ کو گر مارا نہنگ و اژدہا،شیر نر مارا تو کیا مارا

(اشعار ذوق)

ہے اس مملکت کی عجب گل زمیں کہیں پھول یاں کے سے ہوتے نہیں

دل بستہ دیکھ ان کو ہو باغ باغ جو سونگھے تو بھر جائے بو سے دماغ

(ہندوستان کے پھول)

ارے چھوٹے چھوٹے تارو کہ چمک دمک رہے ہو

تمھیں دیکھ کر نہ ہووے مجھے کس قدر تحیر

(تاروں بھری رات)

فہرست منتخبات اردو (نثر) پہلا صفحہ موجود نہیں،اس لیے مرتب کے نام کا علم نہیں ہو سکا۔

تعداد صفحات :۱۶۳ مطبع،سنہ اشاعت کا علم بھی نہیں ہو سکا۔

کتاب میں سکنتلا (شکنتلا کی بجائے سکنتلا لکھا گیا ہے)،آرایش محفل، گنج خوبی، تاج گنج روضے کی تعریف،رویائے مرزا، خواب پریشاں اور عاصم کی کہانی کے عنوانات سے منتخبات شامل ہیں۔آخری دو کہانیاں مکمل شامل کی گئی ہیں،جب کہ باقی انتخابات ہیں۔کسی انتخاب کے ساتھ مصنف کا نام درج نہیں کیا گیا۔

اردو کا قاعدہ : سلسلہ قدیم،لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے

مؤلف کا نام درج نہیں تعداد صفحات :۳۲

انجمن حمایت اسلام،لاہور نے کتب خانہ نظامیہ سے بغرض رفاہ عام شایع کیا۔

حروف تہجی،حروف کی حرکات، جوڑ توڑ، سادہ ابتدائی جملوں پر مشتمل یہ قاعدہ سررشتہ ءتعلیم پنجاب و دیگر صوبہ جات کے لیے منظور شدہ تھا۔قاعدے سرورق پر سرکلر اور چٹھی نمبر دیے گئے ہیں جن کے تحت اسے الہٰ آباد،دہلی،اجمیر مارواڑ،بمبئی، آسام شیلانگ کے مکتب مدارس کے لیے منظور کیا گیا تھا۔لڑکے اور لڑکیوں کے لیے کی وضاحت اس لیے درج ہے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک لڑکے اور لڑکیوں کی ریڈریں الگ الگ ہوا کرتی تھیں۔چوں کی اس قاعدے میں مضامین نظم و نثر نہیں ہیں،جن کے ذریعے

لڑکوں اور لڑکیوں کو اخلاق واقدار کے الگ الگ تصورات کی تعلیم دی جاتی تھی، اس لیے اس قاعدے میں صنفی تفریق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

بیسک ریڈر: حصہ ۴

[اتر پردیش کے بیسک اسکولوں کے چوتھے درجے کے واسطے]

ڈاکٹر عباد الرحمٰن تعداد صفحات :۱۴۴

(راجہ) رام کمار پریس، وارث نول کشور پریس لکھنو، س ن

ڈاکٹر عباد الرحمٰن (پی۔ایچ ڈی ،لندن ، جوائنٹ سیکرٹری تعلیمات اتر پردیش) کی مؤلفہ یہ کتاب حکومت اتر پردیش کے سررشتہء تعلیم نے بیسک سکولوں کے لیے منظور کی تھی۔نظم ونثر کے تیس نمونوں پر مشتمل ہے،جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔دعا (نظم) ۲۔چھاپہ کی ایجاد ۳۔اون ۴۔بڑھے چلو(نظم) ۵۔آب پاشی

۶۔کبیر ۷۔جڑیں اور ان کا کام ۸۔چیتک کی بہادری ۹۔تلسی داس ۱۰۔کھانے کے متعلق چند مفید ہدایتیں

۱۱۔ڈسٹرکٹ بورڈ ۱۲۔چڑیاں کیوں اڑ جاتی ہیں(نظم) ۱۳۔چڑیاں ۱۴۔شیوا جی ۱۵۔شری رام چندر(نظم)

۱۶۔خطوط نویسی۔۱ ۱۷۔گاؤں کا تالاب ۱۸۔خطوط نویسی۔۲ ۱۹۔اچھوت اور راجہ

۲۰۔راجندر پرشاد(نظم) ۲۱۔گاؤں پنچایت ۲۲۔کیلاش ۲۳۔بسنت(نظم) ۲۴۔جہاز سازی

۲۵۔مہاتما بدھ ۲۶۔قطب شمالی اور قطب جنوبی ۲۷۔سوامی رام تیرتھ ۲۸۔سچے بہادر (نظم)

۲۹۔مہاتما گاندھی ۳۰۔وطن میرا بھارت کی پیاری زمین ہے

کتاب کے پیش لفظ میں کئی 'مفید' معلومات موجود ہیں۔مثلاً یہ کہ اتر پردیش کے ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے مدرسوں میں بیسک تعلیم دی جارہی تھی،جن کے لیے یہ کتاب تالیف ہوئی۔جے سی پاؤل، ڈائریکٹر محکمہء تعلیم تھے اور ان کی ہدایت پر کتابوں میں'' بیسک تعلیم کے مطابق صرف مواد ہی فراہم نہیں کیا گیا، بلکہ بچوں کے پڑھنے کی عمدہ عمدہ کتابیں بھی پیش کی گئیں۔'' حامد اللہ افسر نے اس کتاب کی نظمیں لکھیں۔لہٰذا یہ کتاب برصغیر کی آزادی سے پہلے مرتب ہوئی تھی اور شایع ہوتی رہی۔پیش لفظ کے بعد ''نظر ثانی کے بعد'' کے عنوان سے تحریر موجود ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر ایڈیشن آزادی کے بعد شایع ہوا اور اس میں بعض تبدیلیاں کی گئیں۔لکھا ہے:'' دس برس ہوئے یہ کتاب لکھی گئی ۔ اس عرصہ میں دیش کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہم نے آزادی حاصل کی۔دیش آج آزاد ہے۔اب ہمارے بچے آزاد دیش کے شہری ہیں۔آزادی کو قائم رکھنا اور بھارت کو ہر قسم کی ترقی دینا انھیں کا فرض ہوگا،اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے ننھے ننھے بچے ، بہادر، سچے،محبّ وطن ،ایثار کرنے والے اور آزاد خیال بنیں۔انھیں باتوں کو نظر میں رکھ کر اس کتاب پر نظر ثانی کی گئی ہے۔''

کتاب میں سائنسی معلوماتی مضامین کے علاوہ ایک کہانی (اچھوت اور راجہ) اور تاریخی سوانحی تحریریں ہیں۔کبیر،تلسی داس، شیوا جی،

مہاتما بدھ، سوامی رام اور مہاتما گاندھی کو بچوں کے رول ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔کوئی تحریر مسلمان شخصیت پر نہیں ہے۔مسلمانوں کا جہاں بھی ذکر آیا ہے غیر ملکی حملہ آوروں اور ہندوؤں کے دشمن کے طور پر آیا ہے۔اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ بھارت نے آزادی کو فوراً بعد جس قومی تصور کے تحت اپنا تعلیمی نصاب تشکیل دیا اس میں مشترکہ تہذیبی اقدار کی گنجائش نہیں تھی۔اگرچہ بعد میں بھارت کی شناخت ہی مشترکہ تہذیبی تصورات پر استوار کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

یہ کتاب اس امر کی 'عمدہ' وضاحت کرتی ہے کہ بیسک تعلیم کا اہم مقصد ریاستی آئیڈیالوجی کا فروغ تھا۔پہلے ریاست ،نوآبادیاتی نظام کی حامل تھی، اس لیے اس کی آئیڈیالوجی،نو آبادیات کو قائم رکھنا اور اس کے ثمرات سے اپنی جھولی بھرنا تھا۔آزادی کے بعد بھارت کی آئیڈیالوجی ''بہادر، سچے محبّ وطن، ایثار کرنے والے اور آزادخیال شہری تیار کرنا تھا۔'' چناں چہ کتاب پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ان عناصر کو حذف کر دیا گیا ہے جو انگریز سرکار کے مفادات کے نگہبان تصور کیے گئے اور ان کی جگہ ایسے اسباق شامل کیے گئے ہیں جو نئی بھارتی سرکار کے مفادات کی آبیاری کر سکیں۔گویا طالب علموں کی تقدیر وہی رہی۔وہ پہلے ہی کی طرح اس علم سے محروم رہے جو انھیں حقیقی آزادی اور وسعت نظری کے ساتھ زندگی کو گزارنے کے قابل بناتا ہے۔کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نو آبادیاتی عہد میں کامن ورنیکلر لینگوئج اور مشترکہ تہذیب کے تصور میں جو باتیں بالواسطہ تھیں،وہ اب براہ راست ظاہر ہو رہی ہیں۔کامن ہندوستانی لینگوئج کے تصور میں ،قدیم ہندوستانی تہذیب کا احیا ،ایک زیریں لہر کے طور پر موجود تھا، یہاں وہ پوری قوت سے باہر کی طرف جوش مارتا محسوس ہوتا ہے۔مثلاً 'چیتک کی بہادری' مہا رانا پرتاب کے گھوڑے کی تعریف پر مشتمل ہے۔اسے شیام نرائن جی پانڈے نے ہندی میں لکھا تھا۔حامداللہ افسر نے معمولی تندیلی کے ساتھ اسے اردو میں ڈھالا ہے۔چیتک اس گھوڑے کا نام ہے جس پر رانا پرتاب نے اکبر کے خلاف جنگ لڑی تھی۔

کبھی چابک اس پر پڑا نہ تھا
کبھی کوڑا اس کے لگا نہ تھا
دشمن پر اڑ کے وہ دوڑا تھا
یا آسمان پر گھوڑا تھا

اسی طرح مضمون 'مہاراج شیو جی' میں تحسین آمیز پیرائے میں لکھا ہے کہ ''مغل بادشاہوں کی غلامی سے ملک کو چھڑانے کے لیے ان کا نام اسی طرح مشہور ہے جس طرح انگریزی حکومت ختم کرنے کے لیے مہا تما گاندھی کا۔ان دونوں بزرگوں کے طریقہ کار میں فرق یہ تھا کہ مہاتما گاندھی تو اہنسا پر اعتقاد رکھتے تھے،لیکن شیو جی جنگ کے ذریعے دشمنوں کو زیر کر لیا کرتے تھے۔''اس طور مشترکہ تہذیب کے تصور میں مغل حکومت اور کلچر کو ہندوستانی قرار دینے کی جو روش ابھری تھی، اب اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔مسلمان بادشاہ 'غیر ملکی' سمجھے جانے لگتے ہیں۔'' اصل میں وہ مسلمان بادشاہوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے اور اپنے ملک پر غیر ملکیوں کی حکومت وہ گوارا نہ کر سکتے تھے،اس لیے ان کی جنگ بدیشی حکم رانوں کے خلاف تھی۔'' یہیں بس نہیں، براہ راست بچوں سے خطاب کر کے انھیں شیوا جی کی پیروی کی تعلیم دی جانے لگتی ہے۔'' بچو،تمھیں بھی مہاراج شیوا جی کی طرح بہادر، باہمت اور محبّ وطن ہونا چاہیے اور غیر ملکی دشمنوں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔''اپنے مضمرات کے اعتبار سے یہ خاصی خوف ناک نصیحت

ہے۔شیواجی نے جن لوگوں کو غیر ملکی دشمن سمجھا تھا،وہ بھارت میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ان سے ملک کو محفوظ رکھنے کا مطلب کیا تھا؟ یہ آگے چل کر بابری مسجد سے لے کر گجرات کے فسادات اور مستقل پاکستان دشمنی کی صورت میں واضح ہوتا رہا ہے۔۔۔اس کتاب میں شیوا جی کے بعد مہاتما گاندھی کو رول ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔شیوا جی نے مسلمانوں (اورنگ زیب کے عہد میں)سے آزادی کی جنگ لڑی تھی اور مہاتما گاندھی نے اہنسا کے ذریعے انگریزوں سے بھارت ماتا کو آزاد کرایا تھا۔''ہمارا دیش صدیوں سے غلام تھا۔بیرونی لوگ آئے اور انھوں نے ہم سے اس سونے کی چڑیا کو چھین لیا۔بھارت ماتا نے لا تعداد سپوت پیدا کیے۔ان گنت بڑے سے بڑے انسان اس ملک سے نکلے لیکن اگر کسی نے صحیح معنوں میں بھارت ماتا کے آنسو پونچھے ہیں تو مہاتما جی تھے۔''

کتاب میں ایک نیم واضح دشمن کے خلاف بچوں کو تیار کرنے کی کاوش ملتی ہے۔یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اب کس ''دشمن'' کے خوف کے مقابلے میں بچوں کو ایثار کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔کتاب میں لفظ ہندوستان کی جگہ بھارت نے لے لی ہے۔نظموں کا آہنگ عسکری ہو گیا ہے۔من موہن لال دویدی کی ہندی نظم کا اردو ترجمہ شامل کتاب ہے۔اس نظم کے مطالعے سے لگتا ہے کہ جیسے ابھی طلبا کو محاذ جنگ پر بھیجنا اور انھیں اپنی جان، اپنے وطن پر نثار کرنے کے لیے آمادہ کرنا ہے۔ایسی نظموں کی تہ میں بھی یہ خیال موجود ہوتا ہے کہ عوام کی جان ریاست کی ملکیت ہے،لہٰذا کسی ہنگامی حالت میں ریاست عوام سے ان کی جان 'واپس' لے سکتی اور اسے 'تصرف' میں لا سکتی ہے۔نظم کے یہ ٹکڑے جنگی ترانے کا حصہ لگتے ہیں۔

نہ تیر اور کمان ہو
نہ تیغ اور سنان ہو
نہ وردیوں کی شان ہو
ہٹو نہیں ڈرو نہیں
بڑھے چلو، بڑھے چلو

برستی ہر سو آگ ہو
چھڑا قضا کا راگ ہو
لہو کا اپنے بھاگ ہو
اڑو وہیں گڑو وہیں
بڑھے چلو، بڑھے چلو

یہ کتاب استعماری عہد کے اوراس کے خاتمے کے بعد نمو پانے والے قومی تصورات کے تقابل کا موقع فراہم کرتی ہے۔آزادی سے قبل اور بعد ،دونوں زمانوں میں نصاب قومی تصورات کی تبلیغ کا ذریعہ رہا۔آئیڈیالوجی کے فروغ کو نصاب کی ریڑھ کی

ہڈی کا درجہ حاصل رہا ہے۔ استعماری آئیڈیالوجی میں ہندوستان کو آزادی کی خواہش سے باز رکھنے پر زور تھا اور بھارتی آئیڈیالوجی میں اپنی آزادی کی ایک ''دشمن'' کے مقابلے میں حفاظت کرنے پر اصرار ملتا ہے۔

لڑکیوں کی لورمڈل ریڈر [درجہ ششم کے لیے]

مؤلف کا نام درج نہیں تعداد صفحات :۲۱۲

پبلشر، سنِ تصنیف واشاعت نہیں دیا گیا

نظم ونثر کے ۴۷ نمونوں پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔حمد (نظم) از ترانہ شوق ۲۔ ماں حسن نظامی ۳۔انمول موتی (نظم) انتخاب از انمول موتی

۴۔گھر کی تربیت: مولوی ذکاء اللہ ۵۔انتظامِ خانہ داری: مولوی نذیر احمد ۶۔علم (نظم)

۷۔طرزِ تحریر سید ممتاز علی ۸۔حبِّ وطن (نظم) سید علی حیدر زیدی

۹۔دیہات کی زندگی مولوی عبدالحلیم شرر ۱۰۔خاکِ ہند (نظم) چکبست لکھنوی ۱۱۔خوشامد سر سید احمد خاں

۱۲۔بکاؤلی کا گل نہ بتانا (نظم) از گلزار نسیم ۱۳۔اصلی شرافت (نظم) آزاد دہلوی ۱۴۔اہلیا بائی (۱) مرزا حبیب حسین

۱۵۔اہلیا بائی (۲) مرزا حبیب حسین ۱۶۔ پیاری برسات (نظم) شرر کاکوروی ۱۷۔خرچ مولوی ذکاء اللہ

۱۸۔اسکیمو (۱) مرزا حبیب حسین ۱۹۔اسکیمو (۲) مرزا حبیب حسین ۲۰۔ہمارا تاروں بھرا آسمان (۱) بلقیس جہاں بیگم

۲۱۔ہمارا تاروں بھرا آسمان (۲) بلقیس جہاں بیگم ۲۲۔ہمارا تاروں بھرا آسمان (۳) بلقیس جہاں بیگم

۲۳۔تیمار داریاز ہندوستانی گھروں میں تیمارداری ۲۴۔عجز وانکسار (نظم) میر ببر علی انیس

۲۵۔سلطان رضیہ بیگم (۱) مرزا حبیب حسین ۲۶۔سلطان رضیہ بیگم (۲) مرزا حبیب حسین

۲۷۔سلطان رضیہ بیگم (۳) مرزا حبیب حسین ۲۸۔چپ کی داد (نظم) الطاف حسین حالی

۲۹۔مصر اور مصر کے باشندے (۱) مرزا حبیب حسین ۳۰۔۔مصر اور مصر کے باشندے (۲) مرزا حبیب حسین

۳۱۔مصر اور مصر کے باشندے (۳) مرزا حبیب حسین ۳۲۔پہلے درویش کی سیر (بھائی کی تباہی) میر امن دہلوی

۳۳۔پہلے درویش کی سیر (بہن کی دستگیری) میر امن دہلوی ۳۴۔غروب آفتاب اور سمندر (نظم) محشر لکھنوی

۳۵۔دخانی قوت اور اس کے عجیب نتائج مرزا حبیب حسین ۳۶۔دخانی قوت.....(۲) مرزا حبیب حسین

۳۷۔فلورینس نائٹ انگیل مرزا حبیب حسین ۳۸۔باغ کی صبح (نظم) حضرت فردوس

۳۹۔کوئن وکٹوریا کی الماسی جوبلی مولوی ذکاء اللہ ۴۰۔رباعیات انیس: انیس

۴۱۔امید کی خوشی: سر سید احمد خاں ۴۲۔امید کی جھوٹی صورت از کالج میگزین علی گڑھ

۴۳۔گزرا ہوا زمانہ(۱) تہذیب نسواں، ماخوذ تہذیب الاخلاق ۴۴۔گزرا ہوا زمانہ(۲)ماخوذ تہذیب الاخلاق

۴۵۔مقبرہ نور جہاں)نظم)مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی ۴۶۔زندگی کا زیورمولوی محمد فائق ۴۷۔گائے چکبست لکھنوی

چوں کہ ریڈریں ''صنفی امتیاز'' کی بنیاد پر تیار کی گئیں،اس لیے لڑکیوں کی ریڈروں کے مضامین،لڑکوں کی ریڈروں سے مختلف ہوتے تھے۔ہر دو ریڈروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نو آبادیاتی عہد میں ''صنفی امتیاز'' کس طور ظاہر ہوتا تھا اور ایک صنف کے افراد کی ذہنی تشکیل کا سامان کرنے کے لیے کون سی بنیادیں اور معیارات پیش نظر رکھے جاتے تھے اور جنھیں دوسری صنف کی تعلیم کے دائرے سے باہر رکھا جاتا تھا۔زیرِ نظر ریڈر کا دیباچہ کسی لیڈی پرنسپل کی طرف سے ہے۔اس میں لڑکیوں کی تعلیم کی ایک بنیاد کی وضاحت ملتی ہے کہ ''سیاسی و مذہبی مضامین جو لڑکیوں کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں،ان پر کوئی سبق نہیں لکھا گیا۔پھر ہر سبق کو لڑکیوں کے فائدے کے ترازو پر تول کر رکھا ہے۔'' صنفی امتیاز کی یہ صورت ،عورتوں کو سماج میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل تصور ہی نہیں کرتی۔سیاست و مذہب،سماج کے اہم ستون ہیں،جن کے لیے ایک اعلیٰ سطح کی ذہانت درکار ہے۔یہ صرف مردوں کے پاس ہوتی ہے ۔لڑکیوں میں اجتماعی اور مذہبی زندگی کی تفہیم کی صلاحیت نہیں۔اسی معیار کو بنیاد بنا کر کتاب میں مضامین شامل کیے گئے ہیں۔۔۔نو آبادیاتی نظامِ تعلیم میں لڑکیوں کے لیے کس قسم کے نظامِ اخلاق کا تصور قائم کیا گیا،اور اس تصور میں واضح کیے گئے اخلاقی اوصاف طالبات میں پیدا کرنے کی کیا صورت ہو،ان کی نشان دہی بھی دیباچے میں کر دی گئی ہے:''حوصلہ، ہمت، صبر، محنت، جفاکشی اور استقلال کے اوصاف حمیدہ پیدا کرنے کے لیے سچے تاریخی واقعات اور اشخاص کی سوانح عمریاں پیش کی گئیں ہیں کیوں کہ تاریخ ، فلسفہء اخلاق بالواقعات ہے۔'' علاوہ ازیں دیباچے میں اس ریڈر کے اسباق کی درجہ بندی بھی واضح کی گئی ہے۔''قواء عقلیہ کی تربیت کے خیال سے شروع میں مشاہدہ کے اسباق ،ان کے بعد قوتِ متخیّلہ و متصورہ پر زور دینے والے مضامین اور آخر میں قوتِ استدلال کی تربیت کا سامان رکھ دیا گیا ہے۔اس خیال سے عام اشیا،مناظر قدرت کے متعدد اسباق ،سوانح عمریاں اور کہانیاں دی گئی ہیں۔پھر نئی ایجادوں کے اسباق اور غیر ممالک کے حالات لکھے گئے ہیں۔'' یہاں دیباچہ نگار نے اس امر کا خیال نہیں رکھا کہ قوتِ استدلال کی تربیت کا ذکر کے وہ اپنی اس رائے کی تردید کر رہے ہیں کہ ''سیاسی و مذہبی مضامین لڑکیوں کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔''اگر قوتِ استدلال موجود ہے تو وہ کسی بھی موضوع کی تفہیم کر سکتی ہے۔تاہم اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لڑکیوں کا نصاب تیار کرتے ہوئے،ان کے ذہنی قوا کا جو تصور قائم کیا گیا ہے ،وہ سائنسی نہیں،آئیڈیالوجیکل ہے۔ہندوستانی معاشرے میں عورت کی دنیا''گھر اور مرد'' تک محدود تھی،نو آبادیاتی عہد میں عورت کی تعلیم کی کوششیں کی گئیں ،مگر عورت کی دنیا کا وہی محدود تصور باقی و برقرار رہا۔

کتاب کے مندرجات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چند معلوماتی مضامین کے علاوہ دیگر مضامین سوانحی اور تاریخی ہیں۔ان کا بنیادی مقصد عورت کی اس شناخت کو مستحکم کرنا نظر آتا ہے،جس کی چند ایک جھلکیاں دیباچے میں ملتی ہیں۔اس مقصد کے لیے ''خاتون ہیرو'' کا تصور ابھارا گیا ہے،جو کافی پیچیدہ ہے؛جس میں ایک قسم کی مرکزیت قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے،مگر یہی مرکزیت اس تصور کو چیلنج کرنے لگتی ہے۔مثلاً دیباچے میں ''تاریخ کو فلسفہء اخلاق بالواقعات'' کہا گیا ہے۔چناں چہ لڑکیوں میں ''حوصلہ، ہمت،صبر،محنت، جفاکشی اور استقلال کے اوصافِ حمیدہ'' پیدا کرنے کے لیے ایسے تاریخی واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے،جن میں

عورت ہیرو ہے۔انتظامِ خانہ داری (نذیر احمد کے ناول سے انتخاب) ،اہلیا بائی،سلطان رضیہ بیگم،فلورینس نائٹ انگیل میں قدرِ مشترک ''خاتون ہیرو'' کا تصور ہے۔ان میں بالترتیب انگریز، ہندو ،مسلمان اور یورپی عورت کو عظیم 'کارنامے انجام' دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔اس طور خاتون ہیرو کو 'امتزاجی اور مشترکہ تہذیب' کا نمایندہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی عمل سے اس تصور میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔وجہ یہ کہ یورپی، ہندو اور مسلم تہذیبیں یکساں اہمیت کی حامل نہیں سمجھی گئی تھیں۔ ان میں ایک درجہ بندی قائم ہوگئی تھی۔ہندو اور مسلم تہذیبیں ،یورپی تہذیب کے مقابلے میں 'پس ماندہ، رجعت پسند، زوال پذیر' تھیں اور یورپی ماڈل پر اصلاح طلب تھیں۔اسی طرح برصغیر کی ہندو اور مسلمان تہذیبوں کا مرتبہ بھی یکساں نہیں تھا۔ہندو تہذیب قدیم اور عظیم تھی اور قدامت وعظمت کے تصورات اس کے پرانے ادبی، مذہبی ،اخلاقی متون پر استوار تھے،جب کہ مسلمان تہذیب کا تصور زیادہ تر مغل مسلمان حکم رانوں کے کلچر پر استوار تھا، جسے ملوکانہ قرار دیا گیا تھا۔دل چسپ بات یہ ہے کہ 'خاتون ہیرو' کا امتزاجی تہذیبی تصور وضع کرتے ہوئے، یہ سب باتیں اس میں شامل ہوگئی ہیں اور انہی کی وجہ سے یہ تصور الجھ گیا ہے۔

'انتظام خانہ داری' میں ہندوستان میں موجود ایک عام انگریز عورت کو ہیرو کا درجہ دیا گیا ہے، جب کہ ہندو اور مسلم تاریخ سے جن تاریخی نسوانی شخصیات کو منتخب کیا گیا ہے، وہ عمومی ہندوستانی تاریخ میں استثنیٰ کا درجہ رکھتی ہیں۔اس سبق سے یہ مکالمہ خصوصاً توجہ طلب ہے:

حسن آرا: تم تو میم صاحبہ کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہو،لوگ تو انگریزوں کو عموماً برا سمجھتے ہیں۔

حلیمہ:ان کو انگریزوں سے سابقہ نہ پڑا ہوگا۔ہمارا بھی یہی حال تھا۔ڈرتے ڈرتے ہم لوگوں نے میم صاحبہ سے ملاقات کی ، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں میں تہذیب اور اخلاق کا برتاؤ،دوسروں کی تکلیف اور راحت کا احساس ،ہر چیز کی صفائی کا خیال، آپس میں محبت اور یک جہتی،گھر کے کاموں میں دل چسپی ،انسانی ہم دردی، وقت کی پابندی،محنت کی عادت ہم لوگوں سے زیادہ ہے۔

میم صاحبہ ،حلیمہ کی استانی بنتی اور اسے تہذہب سکھاتی ہے۔میم صاحبہ میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں،جنھیں ہندوستانی لوگوں میں معدوم سمجھا گیا اور جنھیں ہندوستان کو مہذب بنانے کے ثقافتی منصوبے کا حصہ بنایا گیا تھا۔میم صاحبہ ،پوری یورپی معاشرت کی اور حلیمہ ہندوستانی معاشرت کی نمایندگی بھی کرتی ہیں۔چناں چہ یہاں 'خاتون ہیرو' اپنے صنفی دائرے سے باہر قدم رکھتی ہے۔یہ اس کتاب کے خاتون ہیرو کے تصور کی پیچیدگی کا محض ایک پہلو ہے۔

اہلیا بائی اور سلطان رضیہ بیگم برصغیر کے مشترکہ تہذیبی تصور کی نمایندہ ہیں۔چناں چہ ان دونوں کے کردار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر مذہب والوں کے ساتھ یکساں مروت سے پیش آتی تھیں۔ ا اہلیا بائی ،اندور کی رانی تھی۔والیِ اندور لمہار راؤ ہلکر کے بیٹے کھانڈو رائے کی بیوی تھی۔شوہر کی موت کے بعد اندور کی ملکہ بنی۔

سب سے زیادہ قابلِ تعریف یہ وصف تھا کہ اہلیا بائی خود اپنے مذہب کی سخت پابند تھی، پھر بھی غیر مذہب والوں کے ساتھ زیادہ مہربانی سے پیش آتی تھی۔

اسی طرح کی خصوصیات شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطان بیگم میں تھیں۔وہ ۱۲۳۶ء میں ہندوستان کی حکم ران بنی۔''عنانِ

حکومت کو ہاتھ میں لیتے ہی عدل و انصاف کی ہوائیں چلنے لگیں اور ملک پھر سرسبز و شاداب ہو گیا۔''

فلورینس نائٹ انگیل بھی 'خاتون ہیرو' کے تصور کی اہم رکن ہے۔ اس نے نرسوں کی تعلیم و تربیت کی تحریک چلائی تھی اسے ''دنیا کی تاریخ کی واحد خاتون'' قرار دیا گیا ہے جس نے سب سے پہلے نرسنگ کے ادارے کی ضرورت محسوس کی۔''یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر ملک میں نرسوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نہایت معقول انتظام ہو گیا ہے۔'' کوئن وکٹوریا کی الماسی جوبلی کا ذکر کرتے ہوئے، وکٹوریا کو ہیرو سے بھی بلند درجہ دیا گیا ہے۔چناں چہ اس سے مقصود طالبات کو انسپائر کرنا نہیں، انھیں مرعوب و متاثر کرنا ہے۔''دنیا میں شاید چند بادشاہ ایسے ہوں گے،مگر کوئی بانو ایسی بادشاہ نہیں ہوئی کہ جس کی فرماں دہی کی مدت ایسی دراز ہوئی ہو جیسی ملکہ معظّمہ کی فرماں روائی کی۔۔۔اور یہ بات تو کسی مرد بادشاہ اور بانو بادشاہ کو حاصل ہی نہیں ہوئی کہ اس کی قلم رو میں دنیا کے اندر چاروں طرف رعیت ہر رنگ اور ہر مذہب کی مختلف الاغراض ہو۔''

خاتون ہیرو کے اس تصور کی یہ خوبی ضرور ہے کہ یہ اس صنفی عدم مساوات کی بنیادوں پر ضرب لگاتا ہے،جس میں عورت کی دنیا'' مرد اور گھر'' تک محدود ہے۔یہاں جتنی عورتوں کو قابلِ تقلید بنا کر پیش کیا گیا ہے،وہ سماج میں قائدانہ سیاسی کردار ادا کرتی ہیں۔اس طور یہ تصور دیباچے میں دیے گئے'' اصول'' کی تردید کرتا ہے کہ سیاسی مضامین عورتوں کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔اس بات کی وضاحت میں کہا جاسکتا ہے کہ نو آبادیاتی آئیڈیالوجی مقامی زبانوں میں متن سازی پر مکمل اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔تاہم واضح رہے کہ نو آبادیاتی آئیڈیالوجی کے تحت وجود پذیر ہونے والے ورنیکلر متن کے صرف وہ حصے آئیڈیالوجی کے اثر سے'' آزاد'' ہوتے ہیں جو متن کے بنیادی خیال سے روایتی ، استعارتی یا تلازماتی طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔کوئی بھی مقتدرہ،کسی زبان کے استعاراتی اور تلازماتی نظام پر اجارہ حاصل نہیں کر سکتی اور اسی لیے اسے اپنے آئیڈیالوجیکل شکنجے میں کسنے سے قاصر رہتی ہے۔۔۔۔بہ ہر کیف خاتون ہیرو کے اس تصور میں بھی انتخاب ، ترتیب اوراستردار،انکار کی عمومی نو آبادیاتی حکمت عملی موجود ہے۔ہندوستانی تاریخ میں مخصوص شخصیات کا انتخاب کیا گیا ہے۔اہلیا بائی کا انتخاب کیا گیا،مگر جھانسی کی رانی کو مسترد کیا گیا ہے۔اس انتخاب میں اس امر کا انکار موجود ہے کہ مزاحمت پسند کوئی شخصیت ہیرو بن سکتی ہے۔

حصہ نظم میں 'ہندوستانی قومیت' سے متعلق نظمیں زیادہ ہیں۔'خاکِ ہند' میں ہندوستان کی عظمت کا بیان ہے۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج ، عزو شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

مشترکہ تہذیب کا وہی تصوراس کتاب کی نظموں میں بھی ہے،جو لڑکوں کے نصابات میں بھی ہے۔اس تصور میں ان سب

شخصیات کو ایک ہی روایت،یعنی مشترکہ تہذیبی روایت کا ترجمان بنا کر پیش کیا گیا ہے،جو تاریخ میں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے تھے۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

حالی کی 'چپ کی داد' عورت کی مظلومیت کا نوحہ ہے اورا سے سب دکھ سہنے پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب میں اس کا کچھ حصہ شامل اشاعت ہے۔

اے ماؤ ،بہنو ،بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں،قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، جہاں سلامت تم سے ہے
بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں